تدبر لاہور

جاری کردہ: مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مدیر: عبداللہ غلام احمد

یکے از مطبوعات:

ادارہ تدبر قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، چمن آباد، لاہور پاکستان

ای میل: tadabbur@hotmail.com

قرآنِ حکیم

ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
حواشی : مولانا خالد مسعود

خصوصیات:

★ فکرِ فراہی کی روشنی میں قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ

★ نفیس کتابت ★ سفید زمین اور رنگین حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت ★ مضبوط جلد

قیمت : سٹینڈرڈ ایڈیشن -/550 روپے ، حمائل ایڈیشن -/396 روپے

فاران فاؤنڈیشن

122۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور۔ 54600 فون: 042-7595200

حیاتِ رسولِ امیؐ

تصنیف : مولانا خالد مسعود

خصوصیات:

کتبِ سیرت میں پائی جانے والی اختلافی روایات کا محاکمہ

قرآن مجید میں بیان کردہ فرائض و احوال رسول اللہ ﷺ پر مبنی سیرت کی منفرد کتاب

رسول امیؐ کے بارے میں سابقہ کتب کی پیشگوئیوں پر سیر حاصل تبصرہ

★ حواشی اور ضروری حوالے ★ عام فہم سلیس زبان ★ خوبصورت جلد

★ صفحات 600 ★ قیمت -/375 روپے

دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

تدبّر لاہور

شمارہ 85

ستمبر 2004ء

شعبان 1425ھ

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحیؒ
مُدیر:
عبداللہ غلام احمد

مجلس ادارت

◆ محبوب سُبحانی
◆ سعید احمد
◆ سید اسحاق علی
◆ محمد نعمان علی

قیمت 15.00 روپے
سالانہ 60.00 روپے
بیرون ملک 400.00 روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
مولانا امین احسن اصلاحی 2

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ
علامہ حمیدالدین فراہیؒ/
ڈاکٹر عبیداللہ فراہی 4

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری۔ کتاب فی الخصومات کی روایات
مولانا امین احسن اصلاحیؒ/ سید اسحاق علی 21
درس موطا امام مالک۔ کتاب الجہاد کی روایات
امین احسن اصلاحیؒ/ سید اسحاق علی 27

مقالات

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب
پروفیسر عبدالخالق فاروقی 37
نیا عالم۔ نئے نوامیس و قوانین/ محبوب سبحانی 42

مراسلہ و مذاکرہ

حضرت عیسیٰؑ کا ظہور/ امین احسن اصلاحی 52

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور
E.mail: tadabbur@ hotmail.com

مولانا امین احسن اصلاحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ جلوہ گری کس کی ہے

ہر شے اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیئت رکھتی ہے اور پھر اس مقصدِ وجود کی تحصیل و تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے وجود کے اندر اس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرمادیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی، ایک بھنگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکر فشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کے خالق ہی کا! تو وہی خالق ان کا اور سب کا رب بھی ہے!

صرف جاندار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں، سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو و صنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں۔ سیب، انار اور انگور جو دعوتِ شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو ان میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اس کا کرشمہ ہے کہ اس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی۔ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد و نقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ جو کرتا ہے وہی رب ہے نہ کہ ہر متنفس جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے وہ رب بن جائے۔

زمین ہی تک نہیں ایک نظر آسمان پر بھی ڈالیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوس وقزح، یہ

آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے ان کو پیدا کیا اور کون ہے جس نے ان کے فرائض ان کو الہام کیے؟ جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کو ان کے فرائض الہام کیے وہی رب ہے! سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اس کو غائب کر سکے!

اس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملہ میں کوئی دخل ہے نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اسی نے ہمیں جبلت و فطرت اور عقل و ادراک و شعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ انہی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی و تری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں بلکہ چاند و مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اس مغالطہ میں ہے وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ نوامیس دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اس پر اتنا مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔ (تفسیر تدبر قرآن، جلد چہارم)

❁❁❁❁

> اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ اپنی دنیا کو پیدا کر کے اس کو چھوڑ نہیں بیٹھا ہے۔ بلکہ وہی ہر چیز کا نگہبان بھی ہے اس وجہ سے بندوں کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آسمانوں اور زمینوں کے تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں۔ بندوں کو جو کچھ بھی آسمان و زمین سے حاصل ہوتا ہے سب اسی کی بخشش سے حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ حاصل ہوگا اس کی عنایت سے حاصل ہوگا۔
>
> (مولانا امین احسن اصلاحی)

علامہ حمید الدین فراہیؒ / ترجمہ: ڈاکٹر عبداللہ فراہی

تفسیر سورہ بقرہ

۔۱۱۔

چھٹا مقام "للمتقین" کا موقع و محل۔ یعنی اس جامع اور کامل وصف کے مقام کا ذکر:

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ دین میں تقویٰ کا بہت بڑا درجہ اور مقام ہے اور یہ حسب ذیل وجوہ کی بنا پر ہے:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ اول اور اصل چیز ہے جس پر پیغمبر کی نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام خدائی تعلیمات کے لیے تخم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس محور کے مانند ہے جس کے گرد دین خالص اور اطاعت کامل کا پورا نظام گردش کرتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام اعمال کا مبداء انسان کا احساس خیر و شر اور اس کے اندر رغبت و نفرت کا داعیہ ہے جس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو خیر سے دور اور شر سے قریب کرنے والی ہیں۔ انسان اپنے لیے شر کو پسند نہیں کرتا الا آنکہ وہ اس کے نتائج سے بے پروا ہو گیا ہو یا دنیا کی محبت اس پر اس درجہ غالب آ گئی ہو کہ وہ اس کے انجام کو دیکھ ہی نہ سکے، بالکل اندھا ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبر کی پہلی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ انذار اور تحذیر کے ذریعہ اسے خواب غفلت سے بیدار کر دے یہاں تک کہ اس کے اندر عواقب پر غور کرنے، خیر کی طرف راغب ہونے اور شر سے دور بھاگنے کی قوت و صلاحیت جاگ اٹھے۔ بالفاظ دیگر پیغمبر اس میں تقویٰ کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے اس کی روحانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقویٰ میں یہ خوبی ہے کہ وہ تذکر اور تفکر کی کیفیت کو ابھار دیتا ہے۔ فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ○ (اعراف:۲۰۱)

﴿بے شک جن لوگوں نے تقویٰ کو شعار بنایا جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہوتی ہے تو وہ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور فوراً ہی ان کو سجھائی دینے لگتا ہے۔﴾

تذکرہ:

پیش نظر رہے کہ تقویٰ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کا دروازہ ہے۔ جو اس دروازہ میں داخل ہوتا ہے وہ قرآن سے ہدایت قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو اللہ تعالیٰ نے مومنین کا شعار بنایا ہے اور پیغمبر لوگوں کو تقویٰ کی طرف بلاتا ہے اور اس کیفیت کو ان اندر ابھار دیتا ہے۔ چنانچہ جو شخص خدا سے ڈرنے لگتا ہے وہ توحید و آخرت پر بے چون و چرا ایمان لے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خاص سے ایسے لوگوں کو تمام انسانوں سے چھانٹ کر الگ کر لیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ (انفال:۲۹)

﴿اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہارے لیے فرقان کو نمایاں کرے گا اور تم سے تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا۔﴾

اور ایسا ہی وقوع پذیر ہوا۔ جن لوگوں نے اہل و عیال اور مال و منال کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی انہوں نے ہی تقویٰ کو اپنا شعار بنایا اور مزید ہدایت کے لیے آمادہ ہوئے۔ پیغمبر کا پہلا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو کبھی توحید کی دعوت دے کر انذار کرے اور کبھی آخرت کی یاد دلا کر انہیں ڈرائے تا کہ ان کے اندر تقویٰ ابھر آئے اور قرار پکڑ لے۔ اس کے بعد جو شخص پیغمبر اور اس کی دعوت پر ایمان لاتا ہے اور ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مزید ہدایت اور تقویٰ سے نوازتا ہے۔ پھر وہ ان میں جتنا قدم آگے بڑھاتا ہے اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ ان میں افزونی فرماتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ (محمد:۱۷)

﴿اور جنہوں نے راہ ہدایت اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کی پرہیزگاری ان کو عطا کی۔﴾

اور یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ افراد پر اور بحیثیت مجموعی پوری امت پر اپنی رحمت اس وقت نازل فرماتا ہے جب ان کے ہاتھ میں فرقان (حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز) دے دیتا ہے اور ان کو ایک علیحدہ امت کی حیثیت سے کھڑا کر دیتا ہے۔ اس وقت وہ فرقان اور خاص شعار ان کے پاس ہوتا ہے اور تقویٰ ہی مومنین کا خاص شعار ہے۔

توحید کے اندر تقویٰ:

وَ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ○ (مومنون:۵۲)

﴿اور میں تمہارا رب ہوں سو مجھ سے ڈرتے رہو﴾

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

پورے حساب کتاب کے ساتھ کاروبار ہونا چاہیے۔ مقرر منافع تو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں آپ کا عمل دخل ہے اور منافع کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ شرائط معلوم ہونے کے بعد ہی حکم لگایا جاسکتا ہے۔

شریعت کا اصول یہ ہے کہ الحلال بین و الحرام بین (حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے) اور ان کے درمیان متشابہات ہیں تو ان سے بچو۔ یعنی جو قطعی حرام ہے اس کو چھوڑ ے اور جو قطعی حلال ہے اس سے فائدہ اٹھائے اور اگر مشتبہ ہے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے بچو اس لیے کہ وہ حرام میں ڈال دے گا۔

سوال: رسول اور نبی دونوں کے ایک ساتھ آنے میں حکمت کیا ہے اور ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

جواب: رسول اور نبی میں فرق تو میں بہت وضاحت کے ساتھ کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں اور تفسیر میں بھی لکھ دیا ہے۔ نبی کا مشن بھی انذار و تبشیر ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، بدعتوں کو مٹاتا ہے اور نیکی کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اپنی دعوت میں کامیاب ہو یا نہ ہو۔ رسول اللہ کی عدالت ہوتا ہے، وہ جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کو انذار و تبشیر سب کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اعلان کرتا ہے کہ اگر تم نے میری بات مانی تو خیر ہے ورنہ ختم کر دیے جاؤ گے۔ نبی یہاں تک نہیں جاتا۔ اقوام نوح، مدین، شعیب، لوط اور عاد و ثمود سب کی طرف رسول آئے وہ ان قوموں کا فیصلہ کر کے گئے۔ آنحضرت ﷺ رسول اور نبی دونوں ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازم نہیں کہ رسول بھی ہو۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

❁❁❁❁❁

ایمان کا فطری راستہ عقل و دل کا راستہ ہے۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

نام کتاب	قیمت
تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ	
مجموعہ تفاسیر فراہی	328/-
[illegible]	80/-
[illegible]	96/-
تالیفات مولانا امین احسن اصلاحیؒ	
تدبر قرآن [illegible]	2952/-
تدبر قرآن [illegible]	328/-
[illegible]	350/-
[illegible]	360/-
مبادی تدبر قرآن	120/-
مبادی تدبر حدیث	105/-
[illegible]	165/-
[illegible]	60/-
[illegible]	60/-
[illegible]	285/-
[illegible]	120/-
[illegible]	120/-

نام کتاب	قیمت
اسلامی قانون کی تدوین	90/-
اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	90/-
اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	120/-
قرآن میں پردے کے احکام	15/-
[illegible]	138/-
تزکیۂ نفس	105/-
مقالات اصلاحی (جلد اول)	195/-
[illegible]	34/-
مقالات اصلاحی (جلد دوم)	--
[illegible]	--
تالیفات مولانا خالد مسعودؒ	
قرآن حکیم [illegible]	550/- 396/-
[illegible]	375/-
اسباق نحو	36/-

ملنے کے پتے

❁ **ادارہ تدبر قرآن و حدیث**، رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی سمن آباد لاہور

❁ **فاران فاؤنڈیشن** 122۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور۔ 54600 فون: 042-7595200

❁ **دارالتذکیر** رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ٥ (یونس:۳۱)

﴿ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو تدبیر امر کرتا ہے تو وہ جواب دیں گے اللہ۔ تو ان سے کہو کیا تم اس سے ڈرتے نہیں۔﴾

اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اللہ کی طرف دعوت دینے کی ابتدا انذار اور ان باتوں سے لوگوں کو خبردار کردینے سے کی جن میں وہ مبتلا تھے، چنانچہ ابتداء وحی میں فرمایا ہے۔

يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (مدثر:۱۔۲)

﴿اور چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور انذار کر۔﴾

اور سورہ شعراء میں اس کی تصریح انبیاء کی دعوت کے ذکر میں بایں الفاظ آئی ہے:

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ٥ (۱۰۔۱۱)

﴿اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ ظالم قوم فرعون کے پاس جا، کیا وہ ڈریں گے نہیں!﴾

آگے اسی سورہ میں ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ٥ (۱۰۵۔۱۰۸)

﴿نوح کی قوم نے رسولوں کی تکذیب کی جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک پیغمبر امین ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔﴾

اسی سے ملتی جلتی بات حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کے ذکر میں دوبار، حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کے ضمن میں ایک بار اور حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے سلسلے میں دومرتبہ دہرائی ہے، یہاں تک کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کو دعوت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ (۲۱۴) ﴿اور اپنے قریب خاندان والوں کو ڈراؤ﴾

اسی کی مثل دوسری جگہوں پر بھی جہاں انبیاء کی دعوت کا تذکرہ آیا ہے فرمایا ہے۔ مثلاً:

اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ. (نوح:۱)

﴿ہم نے نوح کو اس کی قوم کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو انذار کرو﴾

دعوت کا یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اعمال کے نتائج و عواقب لازماً سامنے آکر رہیں گے تاکہ وہ اپنے کرتوتوں پر نظر ڈالیں اور جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس سے بیدار ہو جائیں اور یہ جان لیں کہ آج کے بعد کل بھی آنے والا ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ پیغمبر اپنے اس کام میں برابر لگا رہتا ہے اور جس کے اندر روح بیدار ہوتی ہے یعنی اس میں غور و فکر کی صلاحیت اور خیر کی طرف رغبت کا جذبہ کام کر رہا ہوتا ہے وہ متنبہ ہو جاتا ہے، یاددہانی کی باتوں کو غور سے سنتا ہے، تقویٰ کے دروازہ میں داخل ہوتا ہے اور حق کو قبول کرنے اور خیر کو اختیار کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ یہی تقویٰ کا اولین ظہور ہے جو قوت سے فعل کی شکل اختیار کرتا ہے اور اسی سے صحیح ارادہ اور صحیح نیت کا آغاز ہوتا ہے جو عقائد و اعمال کی درستگی کی منزل تک لے جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ ہی پر ہر چیز کی بنیاد ہے، اس کی حیثیت تخم کی ہے اور اسی سے ہر عمل کی ابتدا ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ دین میں اس کی قدر و قیمت کی یہ ہے کہ اس سے پھوٹنے والی شاخیں نہایت اہم ہیں۔ اس اعتبار سے وہ توحید، آخرت اور احکام شریعت پر ایمان کی راہ دکھاتا ہے۔ اس طور پر تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں آدمی جس چیز سے سب سے پہلے بچنا چاہتا ہے وہ شرک ہے اور اول جس چیز سے کنارہ کش ہوتا ہے وہ اس دنیا سے لگاؤ ہے۔ اس کی پہلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنی آخرت سنوارنے کا کام کرے اور اپنے رب کی اطاعت میں لگ جائے۔ کیوں کہ تقویٰ سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان سے وہ لاتعلق نہیں رہ سکتا اس لحاظ سے وہ پورے دین کا جامع اور اس مجموعہ کا شیرازہ ہے، یہ خصوصیت اس کے اندر اس وجہ سے ہے کہ وہ توبہ اور انابت کی اصل اور ایمان و اطاعت کا مغز اور جوہر ہے۔ فرمایا ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا. (مائدہ:۹۳)

﴿ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے کھائی جب کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور عمل صالح کیا پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ

عمل پیرا ہے۔﴾

یہاں تین بار تقویٰ کا ذکر آیا ہے جو اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح نیز احسان کی بنیاد اور جڑ ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ بعض وقت وہ صرف اصل کا ذکر کرتا ہے کیوں کہ فروع اس میں شامل ہوتی ہیں۔ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًاo (نساء:۱۳۱)

﴿اور تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہم نے انہیں بھی ہدایت کی اور تمہیں بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور تم کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ غنی وحمید ہے۔﴾

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اکیلے تقویٰ کا حکم دے کر ایک طرح سے پورے ایمان واسلام کا حکم دے دیا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ تمام احکام اور صفات خیر کی تعبیر اس سے کی جائے اور اگر اس کے ساتھ فروع کا بھی ذکر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تفصیل مقصود ہے جیسا کہ الفاظ کی شرح کے باب میں گزر چکا ہے۔

تقویٰ کی یہ قدر و منزلت اس پہلو سے ہے کہ ہر خیر کے نیچے وہ ایک پوشیدہ صفت کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے اہل ایمان کا توشہ قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ:۱۹۷)

﴿اور تقویٰ کا زادِ راہ لو کیوں کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے۔﴾

چنانچہ ایک بندۂ مومن اپنے رب کی جانب سلوک کی راہ طے کرنے میں اسی کے سہارے جیتا اور زندگی گزارتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کے بعد اسے اختیار کرنے کا حکم دیا کیونکہ ایمان اس کے بغیر مکمل تو کیا صحیح بھی نہیں ہو سکتا، اور یہی حال اعمال کا بھی ہے۔ فرمایا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَo (حشر:۱۸)

﴿اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ہر نفس کو جائزہ لینا چاہیے جو اس نے کل کے لیے کیا ہے اور اللہ سے خوف کھاؤ، بے شک اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔﴾

نیز فرمایا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (حج:۳۷)

﴿اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ. (انفال:۲)

﴿مومن تو بس وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں۔﴾

دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَo (مائدہ:۲۷)

﴿اللہ صرف متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔﴾

اسی سلسلہ کی ایک اور آیت ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (حجرات:۱۳)

﴿اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ لائق اکرام وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔﴾

معلوم ہوا کہ تقویٰ ہی روح اور زندگی ہے اور اسی پر سارے دینی امور کا دار و مدار ہے جس سے ہر عمل پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن ان آیات پر ہم اپنی بات پوری کرنا چاہتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَo وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَo اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَo (مومنون:۵۷-۶۱)

﴿بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں رہتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل خائف ہوتے ہیں کہ انہیں خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان میں آگے نکل جانے والے ہیں۔﴾

ان آیات پر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ تقویٰ مذکورہ بالا تمام باتوں کو ایک شیرازہ میں پروئے ہوئے ہے۔ خشیت رب، آیات پر ایمان، توحید، خوف آخرت کے ساتھ زکوۃ دینا اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنا سب آپ کو ایک سلسلۂ نظام میں بندھے ہوئے دکھائی دیں گے۔

۳۔ تیسری وجہ اس کی قدر و قیمت کی اس پہلو سے ہے کہ وہ اہل ایمان کی پہچان اور ان کا نام اور لقب ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ کثرت سے ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لباس قرار دیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" . (اعراف:۲۶)

﴿اور تقویٰ کا لباس ہے جو سب سے بہتر ہے۔﴾

چنانچہ یہ تقویٰ ہی ہے جس سے مومن اور کافر کی پہچان ہوتی ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا شعار بنایا ہے اور اسی سے اپنے اس وعدۂ نصرت و مغفرت کو بھی جوڑ دیا ہے جو ان سے اس نے فرمایا ہے۔ اور اسی لیے ان کو متقین کے نام سے پکارا ہے گویا وہ ایک ایسی جماعت ہے جو تمام انسانوں کے درمیان سے الگ کر کے اس نام کے لیے خاص کر دیے گئے ہیں جیسا کہ آیات ذیل میں آپ دیکھ سکتے ہیں:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ.

(قمر:۵۴۔۵۵)

﴿بے شک خدا سے خوف کھانے والے باغوں میں اور نہروں کے پاس ہوں گے ایک مقام عزت میں، ایک مقتدر بادشاہ کے پاس۔﴾

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ. (نور:۱۷)

﴿بے شک خدا سے خوف کھانے والے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔﴾

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ. (حجر:۴۵، ذاریات:۱۵)

﴿بے شک متقین باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔﴾

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. (شعرا:۹۰، ق:۳۱)

﴿اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی۔﴾

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ. (دخان:۵۲)

﴿بے شک متقین مقام امن میں ہوں گے، باغوں اور چشموں میں۔﴾

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ. (زخرف:۳۵)

﴿اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔﴾

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا. (زمر:۷۳)

﴿اور جو لوگ اپنے رب سے خوف کھاتے رہے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔﴾

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ" مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ" مَّبْنِيَّةٌ" تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ. (زمر:۲۰)

﴿البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لیے بالاخانے اور بالاخانوں کے اوپر بھی بالاخانے ہوں گے آراستہ۔ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔﴾

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ.

(ص:۴۹۔۵۰)

﴿اور بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے ہمیشگی کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہوں گے۔﴾

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا. (مریم:۸۵)

﴿جس دن ہم خدا ترسوں کو خدائے رحمٰن کی طرف وفد وفد لے جائیں گے۔﴾

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا. (مریم:۶۳)

﴿یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔

جو شخص اپنے رب کے سامنے اس لباس میں اس طرح آتا ہے کہ اس روحانی شعار سے پہچانا جا سکے وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اس جماعت کے لوگوں سے دنیا و آخرت میں جس نصرت و غلبہ اور فلاح و سعادت کا وعدہ کیا ہے اس سے ان کو ہم کنار کرتا ہے۔ فرمایا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝ (انفال:۲۹)

﴿اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہارے لیے فرقان کو نمایاں

کرے گا اور تم سے تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا اور تمہاری مغفرت کرے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ایک مخصوص امت بنائے گا اور اپنے فضل سے ان کو برائیوں سے پاک کرے گا اور ان کی مغفرت فرمائے گا۔ ایسا ہی وعدہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے بھی کیا تھا کہ اگر وہ تقویٰ اختیار کریں گے تو ان کو معاف کر دے گا۔ فرمایا ہے:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ. (اعراف:۱۵۶۔۱۵۷)

﴿ اور میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے۔ میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے، جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ ﴾

اسی طرح اپنے گھر کی وراثت کے لیے اس نے ان کو مخصوص کیا ہے جیسا کہ فرمایا:

اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۝ (انفال:۳۴)

﴿ اس کے متولی تو صرف اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ ﴾

ساتواں مقام:

تقویٰ کی حقیقت اور ان لوگوں کے شبہ کا جواب جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دین خوف پر مبنی ہوگا تو یہ ایک طرح کا جبر ہوگا اور رب کی طرف رغبت اور محبت سے عاری ہوگا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اصل معاملہ یہ نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ قرآن مجید اور تورات و انجیل نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری رغبت کے ساتھ خدا کی عبادت کریں اور اس کے لیے محبت کو خالص بنائیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ. (بقرہ:۱۶۵)

﴿ اور جو ایمان رکھنے والے ہیں وہ خدا کو سب سے زیادہ چاہنے والے ہیں۔ ﴾

ایک اور جگہ پر ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ. (آل عمران:۳۱)

﴿ کہہ دو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم کو چاہنے لگے گا۔ ﴾

اس عظیم الشان بات کی وضاحت ہم نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں کر دی ہے اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ہم تقویٰ کی حقیقت کے بارے میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ محبت کے منافی نہیں بلکہ عین محبت ہے۔

دین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ معرفت رب اور اس کے ساتھ معرفت نفس سے پیدا ہوتا ہے۔ رب کی معرفت اس کی صفات جود و کرم، علم و حکمت، غنا و قدرت اور قدوسیت و عظمت کے تصور سے حاصل ہوتی ہے۔ اور نفس کی معرفت کے لیے اس کی صفات، اس کے احوال اور اس کے مآل خیر و شر کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اور جب انسان اپنے نفس کے متعلق یہ جان لیتا ہے کہ وہ ایسی خواہشات کی طرف مائل ہے جو ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں اور اس کے ساتھ اس میں بلندی اور پاکیزگی کی طرف بھی رغبت ہے تو وہ برابر خائف اور اندیشناک رہتا ہے اس شخص کی طرح جو آگ کی کھائی کے کنارے کھڑا ہو اور اس کے دوسری جانب بلندی کی طرف جانے کے لیے سیڑھی لگی ہو، اسی طرح جب وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس سے محبت کرنے لگتا ہے، اس کے قرب سے سکون پاتا ہے اس سے چمٹ جاتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ اس کی سعادت صرف اور صرف اس کی قربت میں ہے۔ اس وقت لازمی طور پر:

۱۔ اس کو رب سے دوری اور اس سے دور کرنے والی چیزوں سے حد درجہ خوف لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور برائیوں میں مبتلا ہونے سے خوف زدہ رہتا ہے۔

۲۔ اپنے اوپر رب کے بے انتہا انعامات کا احساس اس کے اندر کمال درجہ کا خشوع اور رب کی عظمت و جلال کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔

۳۔ خدائے پاک کی قدوسیت کا احساس اسے گناہوں میں آلودہ ہونے سے خائف رکھتا ہے۔

۴۔ اس کے عدل کا احساس اسے برائیوں کے نتائج سے خوف دلاتا ہے۔

۵۔ اس کے علم کا احساس اسے خفی برائی سے ڈراتا رہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو اپنے رب کی معرفت رکھتا ہے وہ لازماً اس سے ڈرتا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (فاطر:۲۸)

﴿ اللہ سے تو بس اس کے عالم بندے ڈرتے ہیں۔ ﴾

اور جہاں تک عدم خوف کا سوال ہے تو اس کا سبب غفلت اور اندھاپن نیز باطل کی محبت اور ہوا و ہوس ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ اس نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو ان کے گرد و پیش کی ہلاکت سامانیوں سے خوف دلائیں، انہیں خواب غفلت سے بیدار کریں اور رحمت رب کی ان کو بشارت دیں۔

پیغمبروں کے انذار و تخویف کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ ہلاکت اور بربادی کے جال سے نکل کر ہدایت کے راستوں پر آئیں اور نافرمانی کرنے والے اپنے ہٹ دھرم دشمن ازلی کے پھندوں سے آزاد ہو کر خدائے رحیم و ودود کی طرف بھاگیں۔ قرآن میں آیا ہے:

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (ذاریات:۵۰)

﴿اللہ کی طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔﴾

چنانچہ تمام پیغمبر اسی غرض سے آئے کہ لوگوں کو خوف دلائیں تاکہ وہ اپنے رب کی طرف بھاگیں نہ کہ اس سے فرار اختیار کریں۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ عین محبت اور رضائے رب کی طرف رغبت کا نام ہے لیکن جب کسی کے دل میں خدا کی تقدیس اور اس کے عدل پر یقین میں کمی آ جاتی ہے۔ اور وہ خواہشات نفس اور شیطان کے نقش قدم پر چلنے کے نتائج سے بے خوف اور ان ذمہ داریوں اور فرائض کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے جو ایک عبد کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں تو یہ صفت اس کے اندر معدوم ہو جاتی ہے۔ اس مقام کی پوری وضاحت کے لیے بہت تفصیل چاہیے جس کے مواقع اور ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں پر اختصار سے کام لیا ہے۔

آٹھواں مقام: ''یومنون بالغیب'' کا موقع و محل:

تیرھویں فصل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ایمان بالغیب کی جو تاویلیں کی گئی ہیں ان دونوں ہی کے لحاظ سے وہ عقل کی حد اور انسانیت کا خاصہ ہے۔ یہاں اس بات کو ہم اختصار سے واضح کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ اگر اس کا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی تو بات بہت تفصیل میں چلی جائے گی جس کا یہاں موقع نہیں۔

اس بات کو پیش نظر رکھیے کہ انسان عقل اور اس قوت تمیز کی وجہ سے انسان کہلانے کا مستحق ہوا ہے جو حق و باطل، خیر و شر اور باقی و فانی کے درمیان فرق اور امتیاز کرتی ہے۔ نیز اسے ان چیزوں کی طرف رغبت ہوتی ہے جو اعلیٰ اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی ہیں۔ اسی سے اس کی فضیلت ان تمام جانداروں پر

قائم ہے جو حسی ادراکات، لذائذ اور ان کی طرف رغبت میں اس کے شریک ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں دو درجات ہیں، ایک عقل کا درجہ اور دوسرے حس کا درجہ اور دونوں کے اپنے ادراکات و میلانات ہیں۔ چونکہ انسان کا فضل و کمال عقل کے پہلو سے ہے اس لیے قرآن نے ایک سے زائد آیتوں میں عقل و حس اور انسان اور بہائم کے درمیان حد فاصل کو بتا دیا ہے۔ مذکورہ آیت بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

اس چیز کو واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم عقل اور حواس کے درمیان فرق کے پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں معلوم ہونا چاہیے کہ عقل کو حواس پر بہت سی باتوں میں امتیاز حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

۱۔ حواس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اس کا تعلق صرف حاضر و مشہود چیزوں سے ہے۔

۲۔ اس کی مدت مختصر ہوتی ہے۔

۳۔ صرف جزئیات سے اس کو تعلق ہوتا ہے۔ رہا کلیات کا معاملہ تو ان سے واقفیت کا ذریعہ عقل ہوتی ہے۔

۴۔ اس کا حکم مطلق ہونے کے بجائے آثار طبعی تک محدود ہوتا ہے۔

۵۔ ایک حاسہ جس چیز کا ادراک کرتا ہے دوسرا اس کا ادراک نہیں کر پاتا۔

۶۔ جو لذت کسی حاسہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس کی رغبت اسی کی جانب ہوتی ہے اور وہ خیر و شر اور نیکی اور بدی میں فرق نہیں کر سکتا، جب کہ عقل دونوں پر قدرت رکھتی ہے اور ہر چیز کی تقسیم اور درجہ بندی کر دیتی ہے۔

۷۔ عقل چونکہ ہر چیز کی جامع اور فیصلہ کن طاقت کی مالک ہے اس لیے وہ حواس پر حاکم اور متصرف ہے جس طرح صانع اپنے آلات پر تصرف رکھتا ہے۔

۸۔ عقل ہی جامع الکل اور ہر شے پر حاکم ہے جس سے ذات کی تعبیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ انسان کا وجود کامل ہے جب کہ حواس اس کے ماتحت متفرق قویٰ کا نام ہے۔

۹۔ خارج کا علم صرف عقل سے ہو سکتا ہے کیوں کہ وہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ہر واقعہ کا ایک سبب اور ہر اثر کا ایک مصدر اور منبع ہوتا ہے۔

۱۰۔ نفس کا علم بھی عقل ہی سے حاصل ہوتا ہے کیوں کہ وہ ذات پر نظر رکھتی ہے اور اس کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ نیز یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ہر ادراک کے لیے ایک ادراک کرنے والی ذات کا ہونا ضروری ہے۔

جن امور کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اگر آپ ان پر غور کریں گے تو صاف نظر آئے گا کہ حواس کا تعلق صرف حاضر و مشہود، جزئی اور جلد زائل ہو جانے والی چیزوں سے ہے، اور علم اور یقین کا ذریعہ صرف عقل ہے۔ لیکن جس کی عقل پر بہیمیت غالب آ جاتی ہے اس کو صرف اس دنیا کی فکر ہوتی ہے جو زائل ہو جانے والی اور ہر لحہ تغیر پذیر ہے، ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہوتے ہیں۔ احساس کے اسیر، خواہشات کے غلام۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاهُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْهِ وَکِیْلًا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا.

(فرقان: ۴۳-۴۴)

﴿بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے کیا تم اس کی ذمہ داری لو گے۔ کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں! یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔

رہے اہل عقل تو وہ صرف اس حق سے مطمئن ہوتے ہیں جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔ چنانچہ اس عالم مشہود میں زندگی گزارنے کے باوجود جس کی لذتیں حواس پر ظاہر ہیں وہ اس حق پر ایمان رکھتے ہیں جس کی نشانیاں ان پر کھلی ہوئی ہوتی ہیں کیوں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی اور ہدایت پر ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے کثرت سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہدایت ارباب عقل کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اس آیت میں بے عقلوں کے لیے کہا گیا ہے:

وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ۝ (یونس: ۱۰۰)

﴿اور وہ نجاست ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔﴾

اس طرح کی آیتیں بے شمار ہیں۔

چنانچہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے والے متقیوں کا یہ وصف بیان کر کے کہ وہ ''غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں'' اس امر کی طرف اشارہ کر دیا جو ان کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے وہ ان لوگوں سے ممتاز ہیں جو چوپایوں کی طرح صرف ان چیزوں سے مطلب رکھتے ہیں جن سے وہ اس زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے لیے ایمان کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی

لَّھُمْ. (محمد: ۱۲)

﴿اور جنہوں نے کفر کو اپنا لیا ہے وہ اسی طرح دنیا سے متمتع ہو رہے اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔﴾

اور ان ہی کی یہ صفت بتائی ہے کہ:

لَھُمْ قُلُوْبٌ" لَا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ" لَا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ آذَانٌ" لَا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُوْلٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُوْلٰئِکَ ھُمُ الْغَافِلُوْنَ۝

(اعراف: ۱۷۹)

﴿ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ، یہی لوگ ہیں جو غفلت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔﴾

ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح ان کے اندر حواس کی موجودگی کو ثابت کرتے ہوئے ان میں عقل کے پہلو کی نفی کر دی اور ان کے لیے چوپایوں کی مثال دی۔ نیز یہ بھی بتا دیا کہ وہ ان سے زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ کیوں کہ ان کو ایسی قوت و صلاحیت دی گئی ہے کہ اگر انہوں نے اسے صحیح راستہ پر نہیں لگایا تو وہ ان کو ہلاکت میں ڈال دے گی جیسے کوئی سرکش بے لگام گھوڑے پر سواری کرے اور وہ اسے بار بار گراتا رہے۔ پھر ان کی غفلت کی خانہ خرابی کی وجہ سے انہیں ''غافلون'' کہا جیسے کسی شخص کے گھر کے ساز و سامان میں آگ لگی ہوئی ہو اور وہ اس کے فرش پر کھیل کود میں مصروف ہو۔ جانور تو پھر بھی زیادہ محفوظ و مامون ہیں کہ ان کے لیے جو مدارج مقرر ہیں ان ہی پر وہ قائم ہیں جب کہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اسے چڑھایا تو جا رہا ہے اونچی چوٹی پر لیکن اس کے نیچے گہری کھائی ہے۔ اب یا تو وہ اوپر کی طرف جائے یا نیچے ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ ''والنار مثوی لھم''۔

یہیں سے ''یومنون بالغیب'' کی صفت کا موقع و محل واضح ہو جاتا ہے کہ اسے ''ھدی للمتقین'' کے بعد کیوں لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تقوی سے تنبہ پیدا ہوتا ہے اور انجام کی فکر لاحق ہوتی ہے جیسا کہ ساتویں مقام کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

چنانچہ متقین کا پہلا وصف ایمان بالغیب کو قرار دیا۔ یعنی یہ متقین ہی ہیں جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں اور شاہد سے غائب یا موجود سے ناموجود پر استدلال کرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ حالت غیب میں رہتے ہوئے حق پر ایمان لاتے ہیں برخلاف ان لوگوں کے جو دنیوی زندگی کے صرف

ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اُنْ کا تقویٰ جہالت پر نہیں بلکہ صحت عقل اور صحت علم و معرفت پر مبنی ہے جیسا کہ فرمایا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر:۲۸)

﴿اللہ سے تو بس اس کے عالم بندے ڈرتے ہیں۔﴾

نواں مقام: ''ويقيمون الصلاة و مما رزقناهم ينفقون'' کا موقع و محل

قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ کو تمام بھلائی کے کاموں میں سرفہرست رکھا ہے، چنانچہ اکثر جگہوں پر دوسرے اعمال صالحہ کا تذکرہ نہ کر کے ان ہی کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے جس سے دین میں ان کے مقام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے نیز اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام نیکیوں کی جامع ہیں۔ معمولی غور و فکر سے بھی ان کی اس خوبی کو جانا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ انسان کا ایک تعلق تو اللہ تعالیٰ سے ہے اور دوسرا اس کی مخلوق سے ہے۔ انسان کی بھلائی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اپنے رب کو یاد کرے اور اپنے پورے وجود کو اس سے وابستہ کر دے۔ اسی کے ساتھ مخلوق سے ہمدردی کا سلوک کرے اور اپنے اندر سے بخل اور لالچ کو ختم کر دے اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے سامنے تمام نیکیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ فرمایا ہے:

فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ:۱۵۲)

﴿تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔﴾

نیز فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (حشر:۹، تغابن:۱۶)

﴿اور جو حرص و طمع سے بچائے گئے وہی لوگ فلاح یاب ہونے والے ہیں۔﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّيْنِ ۝

(توبہ:۱۱)

﴿پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔﴾

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔ (مریم:۵۵)

﴿اور وہ اپنے اہل خانہ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔ (مریم:۳۱)

﴿اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کی تلقین کی ہے جب تک کہ میں زندہ ہوں۔﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے احکام شریعت کی ضرورت نہیں رہی بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان تمام کی اصل ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی بات متی کی انجیل (۲۲:۳۵۔۴۰) میں آئی ہے:

''اور ان میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا اے استاد توریت میں کون سا حکم بڑا ہے؟ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ، بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ''۔

ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔ یعنی تمام انبیاء کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خداوند تعالیٰ سے لگاؤ اور مخلوق کے ساتھ ہمدردانہ سلوک دونوں ہی سب سے بڑے احکام ہیں۔ ظاہر ہے کہ نماز اور زکوٰۃ ان ہی احوال کی تکمیل کے لیے ہیں اور جہاں تک ان کے تمام نیکیوں کے جامع ہونے کے تفصیل کا معاملہ ہے تو اس کو ہم نے سورہ کوثر کی تفسیر میں بڑی حد تک بیان کر دیا ہے کیوں کہ وہی اس کے لیے زیادہ مناسب جگہ تھی، یہاں ہم اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔

دسواں مقام: ''والذين يومنون بما انزل اليک'' تا ''هم المفلحون'' کا موقع و محل

اوپر فائز المرام ہونے والے متقین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں یہ دونوں آیتیں ان کے تتمہ کے طور پر آئی ہیں۔ نیز ان میں ایک ایسے جامع وصف کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو اس ایمان سے پیدا ہوتا ہے جو تقویٰ اور تقلید و ہوائے نفس سے پاک خالص عقل کا حصہ ہے اور یہی صحیح ایمان ہے نہ کہ یہود جیسا ایمان جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ۔ (بقرہ:۹۱)

﴿اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس پر تو ہم ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے اور وہ اس

کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ برحق چیز ہے ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو ان کے پاس موجود ہیں۔﴾

یہ لوگ دل کے تقویٰ اور خشیت رب کی وجہ سے نہیں بلکہ تقلید و ہوائے نفس کی بنیاد پر ایمان رکھتے تھے، چنانچہ ان آیات میں اس ایمان کو تفصیل اور کمال کے ساتھ بیان فرما دیا جو تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی رب کی طرف سے آنے والی ہر چیز پر ایمان لانا جس کی بنیاد آخرت کے یقین پر ہے اور یہی تقویٰ کی اصل ہے۔ چنانچہ یہ ٹکڑا معتقدات کے اصول پر مشتمل ہے۔ جس کی پوری صراحت اس میں کر دی گئی ہے جب کہ ماقبل کی آیات میں جیسا کہ پہلے گزرا اعمال کے اصول بیان ہوئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ تقویٰ جس طرح عمل اور زندگی کے معمولات کے درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح وہ کمال علم و اعتقاد کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کیوں کہ تقویٰ آخرت پر یقین اور احکام الٰہی کے لیے اندرونی طلب اور پیاس سے ابھرتا ہے اور اس کی حقیقت انجام پر نظر اور اس کے لیے گہری فکر مندی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

پیش نظر رہے کہ اس ٹکڑے نے تنہا قرآن مجید پر ایمان کو تمام منزل من اللہ کتابوں پر ایمان کی بنیاد بنا دیا ہے۔ اس طرح وہ تمام رسالتوں کا جامع اور اس نبی آخر الزماں پر ایمان جملہ انبیاء و رسل پر ایمان کا حاصل قرار پایا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں آیات حسب ذیل فوائد پر مشتمل ہیں:

۱۔ صحیح خالص ایمان جس سے شک و شبہ اور تقلید کی نفی ہو گئی۔

۲۔ خدائی دین کے ذریعہ اجتماعی وحدت کا قیام جیسا کہ انبیائے کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ○ (انبیاء:۹۲)

﴿بے شک یہ تمہاری امت ایک امت واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔﴾

اسی کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسلام ایک امت واحدہ ہے۔ اس سے آپسی اختلاف اور تعصب کی نفی ہو گئی۔

۳۔ مفصل اور جامع ایمان جس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہ تین فوائد ہیں جو ان دو آیتوں سے نکل رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے کہ ان میں کتنی وسعت و جامعیت ہے یہ فصل یہیں پر تمام ہوتی ہے۔ غور و فکر کے کچھ اور مقامات اگلی فصل میں آئیں گے۔

❁❁❁

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

کتاب فی الخصومات

اختلافی معاملات کے بارے میں کتاب

۱. بَابُ: مَا يُذْكَرُ فِي الْاَشْخَاصِ وَالْخُصُوْمَةِ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْيَهُوْدِ

باب: اشخاص کے بارے میں اور مسلمان اور یہودی کے درمیان جھگڑا ہونے کے بارے میں

۱۔ حَدَّثَنَا اَبُوالْوَلِيْدِ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ عَبْدُالْمَلِكِ بْنُ مَيْسَرَةَ اَخْبَرَنِي قَالَ سَمِعْتُ النَّزَّالَ سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَجُلًا قَرَاَ آيَةً، سَمِعْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ خِلَافَهَا فَاَخَذْتُ بِيَدِهٖ فَاَتَيْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ كِلَاكُمَا مُحْسِنٌ" قَالَ شُعْبَةُ اَظُنُّهُ قَالَ لَا تَخْتَلِفُوْا فَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ اخْتَلَفُوْا فَهَلَكُوْا.

ترجمہ: راوی کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے ایک شخص کو ایک آیت اس کے خلاف پڑھتے سنا جس طرح میں نے نبی ﷺ سے سنا تھا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک ہو۔ شعبہ کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں اختلاف نہ کرو اس لیے کہ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں وہ اس طرح کے اختلاف کے سبب ہلاک ہو گئیں۔

وضاحت: محدثین کے نزدیک حضرت عبداللہؓ سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو میں نے قرآن کی ایک آیت اس طریقہ سے پڑھتے سنا جو اس طریقہ سے مختلف تھا جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا تھا۔ یہاں شخص کا نام نہیں بتایا اور شارحین حضرت عمرؓ کا نام لیتے ہیں جو قابل قیاس ہے کیونکہ ان دونوں کی زندگیاں قریش میں گزریں اور وہ اس محاورے سے اچھی طرح واقف تھے جس پر قرآن نازل ہوا، تاہم میں شخصیت سے تعرض نہیں کرنا چاہتا۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ وہ جب اس شخص کو پکڑ کر

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے گئے تو آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک ہو، یعنی ان کی بھی تصویب کردی اور اس شخص کی بھی۔

یہ قرأت کا مسئلہ ہے۔ ہمارے نزدیک سیدنا عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں وقت کے تمام جلیل القدر صحابہ کی موجودگی میں ان تمام قرأتوں پر جن کے بارے میں اختلافات تھے غور و بحث کر کے قرأت قریش پر جو رائج قرأت تھی اس پر اتفاق کیا۔ اور یہ بات نص سے ثابت ہے کہ قرآن مجید قریش کی قرأت پر نازل ہوا ہے۔ اور مزید سیدنا عثمانؓ نے یہ کیا کہ قرآن مجید کے نسخے اس قرأت پر جس کو قرأت عامہ کہتے ہیں نقل کروا کے تمام مراکز حکومت میں جاری کروا دیے تو صحابہؓ کا جس قرأت پر اجماع ہے اس کے مقابل میں کسی دوسری قرأت کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اس وقت متواتر قرأت عامہ قرأت حفص کی شکل میں ہے اس لیے اب کسی دوسری قرأت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ اس کو بطور تبرک کے بھی نہیں سننا چاہیے۔ سیدنا عثمانؓ کے اس اہتمام کے ساتھ قرأت کے معاملہ کو طے کر دینے کے بعد اور نبی ﷺ کی اس ہدایت کے بعد کہ علیکم بسنتی و سنت الخلفاء الراشدین (میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو)، اب کسی اور قرأت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اگر اس روایت کو آپ اہمیت دیں تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خاص وقت تک ایک ضرورت کے تحت اس اختلاف کو گوارا کیا اور یہ کہ معنی کے کسی اختلاف کا کوئی مظنہ نہ رہا ہو گا۔ یہ تاویل میں نے اس ہدایت کے لیے ایک موقع محل پیدا کرنے کے لیے کی ہے لیکن یہ قضیہ سیدنا عثمانؓ کے زمانے میں پیدا ہوا تو اسی وقت طے ہو گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ باہم اختلاف نہ کرو کیونکہ جن قوموں نے دین میں اختلاف پیدا کیے تو وہ ہلاک ہو گئیں، تو یہ ایک حقیقت ہے۔ تفرقہ امت کو کمزور کرنے والی بیماری ہے جس سے حتی الامکان اجتناب کرنا ضروری ہے۔

۲۔ حَدَّثَنَا يَحْيَىٰ بْنُ قَزَعَةَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ وَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلَانِ رَجُلٌ" مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، وَ رَجُلٌ" مِنَ الْيَهُوْدِ قَالَ الْمُسْلِمُ وَالَّذِي اصْطَفَىٰ مُحَمَّدًا عَلَى الْعَالَمِيْنَ، فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ وَالَّذِي اصْطَفَىٰ مُوْسَىٰ عَلَى الْعَالَمِيْنَ فَرَفَعَ الْمُسْلِمُ يَدَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَلَطَمَ وَجْهَ الْيَهُوْدِيِّ، فَذَهَبَ الْيَهُوْدِيُّ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَاَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ اَمْرِهٖ وَ اَمْرِ الْمُسْلِمِ، فَدَعَا النَّبِيُّ ﷺ الْمُسْلِمَ فَسَاَلَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَاَخْبَرَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا تُخَيِّرُوْنِي عَلَىٰ مُوْسَىٰ، فَاِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَصْعَقُ مَعَهُمْ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ يُفِيْقُ، فَاِذَا مُوْسَىٰ بَاطِشٌ"

جانب العرش فلا ادری اکان فیمن صعق فافاق قبلی او کان ممن استثنی اللّٰہ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ دو آدمی لڑ پڑے، ایک مسلمان اور ایک یہودی۔ مسلمان نے کہا کہ قسم اس کی کہ جس نے محمد ﷺ کو تمام عالم پر فضیلت بخشی تو یہودی نے کہا کہ قسم اس کی جس نے موسیٰ کو تمام عالم پر برگزیدہ کیا۔ مسلمان نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ایک تھپڑ یہودی کے چہرہ پر رسید کر دیا۔ یہودی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی، جو اس کے اور مسلمان کے درمیان ہوا تھا، خبر دی۔ نبی ﷺ نے اس مسلمان کو بلایا اور اس کے بارے میں سوال کیا تو اس نے واقعہ بتا دیا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا تم لوگ موسیٰ پر مجھے ترجیح نہ دیا کرو کیونکہ لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے اور میں بھی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ تو میں سب سے پہلا ہوں گا جس کو ہوش آئے گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں۔ اب یہ مجھے خبر نہیں کہ موسیٰ بے ہوش ہونے والوں میں تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے ہوش ہونے سے بچا لیا۔

وضاحت: جہاں تک انبیاء کی انبیاء کے اوپر ترجیح دینے کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آپ کسی ایک کو دوسرے پر مطلق ترجیح نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو خاص امتیاز کسی کا بیان کیا ہے تو اس پہلو سے آپ کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ تو واضح کر دیا ہے کہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور حضرت موسیٰ کو کس اعتبار سے فضیلت دی تو واضح کر دیا کہ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ حضرت موسیٰ کی فضیلت کہ اللہ نے ان سے کلام کیا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے مقابل میں جو اس حدیث میں فضیلت بیان ہوئی ہے بہت خطرناک قسم کی فضیلت ہو جائے گی۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ جہاں تک ہوش اور بے ہوش ہونے کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ اس سے کہیں چھوٹے واقعہ میں بے ہوش ہو چکے تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تھی، اور اس کو حضرت موسیٰؑ پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ اب یہ کہ قیامت میں جہاں آنحضرت ﷺ اور دوسرے تمام انسان بے ہوش ہو جائیں گے وہاں حضرت موسیٰ کھڑے پایہ عرش پکڑے ہوں گے، تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

تفضیل انبیاء کی بحث میں ہمارے علماء کا مذہب متفق علیہ طور پر غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی مطلق فضیلت ہی کے قائل ہیں۔ وہ اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر یہ حقیقت اس وقت تک منکشف نہیں تھی کہ انا سید ابن آدم (میں اولادِ آدم کا سردار ہوں) اس لیے آپ نے یہ فرما دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی قرآن کے خلاف ہے اس لیے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ والی

آیت یہ بتاتی ہے کہ انبیاء میں سے، کل تو نہ سہی، لیکن اکثر کو کسی نہ کسی پہلو سے ایک دوسرے کے اوپر فضیلت حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی یہ فضیلت کیا کم ہے کہ آپ خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل ہیں۔ آپ کی شریعت قیامت تک کے لیے ہے۔ اور کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے ہے۔ لیکن ہمارے علمائے ایک طرف آنحضرت ﷺ کی مطلق ترجیح کے قایل ہیں اور دوسری طرف ابن شہاب کی اس روایت کے قائل ہیں کہ ہوش اور بے ہوش ہونے کے معاملہ میں حضرت موسیٰ زیادہ قوی تھے۔

ہمارے اور آپ کے لیے صحیح مسلک یہ ہے کہ مطلق فضیلت کا دعویٰ کسی کے لیے بھی نہ کریں۔ آنحضرت ﷺ کو جن اعتبارات سے فضیلت حاصل ہے اور دوسرے انبیاء کو جن اعتبارات سے فضیلت حاصل ہے سب کا یکساں احترام کریں اس لیے کہ انبیاء کسی اور کے ہوں نہ ہوں سب ہمارے انبیاء ہیں۔ ہم اس معاملہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید نہ کریں۔ یہ روایت صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں سے آئی ہے اور شیعوں کے ذریعہ ہمارے ہاں داخل ہوگئی ہے۔

۳۔ حَدَّثَنَا مُوْسٰى ابْنُ اِسْمٰعِيْلَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ" حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيٰى عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِى سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَالِسٌ" جَاءَ يَهُوْدِىٌّ، فَقَالَ يَا اَبَاالْقَاسِمِ ضَرَبَ وَجْهِى رَجُلٌ" مِنْ اَصْحَابِكَ فَقَالَ مَنْ قَالَ رَجُلٌ" مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ ادْعُوْهُ فَقَالَ اَضَرَبْتَهُ قَالَ سَمِعْتُهُ بِالسُّوْقِ يَحْلِفُ وَالَّذِى اصْطَفٰى مُوْسٰى عَلَى الْبَشَرِ، قُلْتُ اَىْ خَبِيْثُ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ فَاَخَذَتْنِى غَضْبَةٌ ضَرَبْتُ وَجْهَهٗ، فَقَالَ النَّبِىُّ ﷺ لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَكُوْنُ اَوَّلَ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ فَاِذَا اَنَا بِمُوْسٰى آخِذٌ" بِقَائِمَةٍ مِنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ، فَلا أَدْرِى أَكَانَ فِيْمَنْ صَعِقَ، اَمْ حُوْسِبَ بِصَعْقَةِ الْأُوْلٰى.

ترجمہ: ابوسعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ بیٹھے تھے کہ ایک یہودی آیا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم تمہارے ایک صحابی نے میرے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے پوچھا کس نے تو اس نے کہا ایک انصاری نے۔ آپ نے ان کو بلایا اور پوچھا کیا تو نے اس کو مارا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے اس کو بازار میں قسم کھاتے سنا کہ قسم اس کی جس نے موسیٰ کو سب آدمیوں پر بزرگی دی تو میں نے کہا اے خبیث کیا محمد ﷺ پر بھی اور مجھ کو غصہ آ گیا اور میں نے تھپڑ مار دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا انبیاء کو ایک دوسرے پر بزرگی نہ دیا کرو۔ قیامت کے دن سب لوگوں کو غش آ جائے گا اور سب سے پہلے میرے اوپر کی زمین شق کر دی جائے گی باہر نکلوں گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا ایک پایہ تھامے ہوئے ہیں۔ اب معلوم نہیں وہ بے ہوش ہونے والوں میں تھے یا ان کی پہلی بے ہوشی ہی ان کے حق میں محسوب کر لی گئی۔ (پہلی بے ہوشی سے مراد موسیٰؑ کی اس وقت کی بے ہوشی ہے جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تھی تو وہ بے

ہوش ہو گئے تھے۔)

وضاحت: یہ وہی اوپر والی روایت ہے لیکن الفاظ کا کچھ فرق ہے۔ مسلمان اس یہودی سے کہتا ہے کہ کیا تو محمد ﷺ پر بھی موسیٰ کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس بات پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت مت دو۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب مطلق فضیلت ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ مطلق فضیلت سے منع کیا گیا ہے۔ خاص خصوصیات کے حوالے سے، مثلاً یہ کہ ہمارے نبی ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، خاتم الرسل ہیں۔ اس میں آپ ان کو دوسرے انبیاء پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

حضور فرماتے ہیں کہ قیامت آنے پر سب بے ہوش ہو جائیں گے تو سب سے پہلے میرے اوپر سے زمین پھٹے گی اور میں برآمد ہوں گا تو مجھے پتہ نہیں ہوگا کہ موسیٰ بھی بے ہوش ہونے والوں میں تھے یا دنیا میں پہلی بے ہوشی پر ان کا حساب ختم کر دیا گیا۔ اس روایت پر میرے وہی شبہات ہیں جو پچھلی روایت میں میں نے بیان کر دیے ہیں۔

۴۔ حَدَّثَنَا مُوْسٰى حَدَّثَنَا هَمَّامٌ" عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ يَهُوْدِيًّا رَضَّ رَاْسَ جَارِيَةٍ بَيْنَ حَجَرَيْنِ قِيْلَ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِكِ اَفُلَانٌ" اَفُلَانٌ" حَتّٰى سُمِّىَ الْيَهُوْدِىُّ فَاَوْمَتْ بِرَاْسِهَا فَاُخِذَ الْيَهُوْدِىُّ فَاعْتَرَفَ فَاَمَرَ بِهِ النَّبِىُّ ﷺ فَرُضَّ رَاْسُهٗ بَيْنَ حَجَرَيْنِ.

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ پوچھا گیا یہ کس نے کیا۔ فلاں نے یا فلاں نے۔ جب یہودی کا نام لیا گیا تو لڑکی نے سر کے اشارہ سے ہاں کہا۔ تو یہودی پکڑا گیا اور اس نے جرم کا اعتراف بھی کر لیا تو نبی ﷺ کے حکم پر دو پتھروں کے درمیان اس کا سر کچل دیا گیا۔

وضاحت: عام طور پر شوافع اور مالکیہ، معمولی فرق کے ساتھ، یہ مانتے ہیں کہ جس طریقہ سے مجرم جرم کرے گا اسی طریقہ سے اس کو سزا بھی دی جائے گی۔ اس کے برعکس احناف کا معروف مسلک یہ ہے کہ قصاص کے لیے جو کارروائی کی جائے گی اس کا ذریعہ تلوار بنے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے ڈبو کے مارا ہے، گھونسے سے مارا ہے یا گلا گھونٹ کے مارا ہے تو جہاں تک Total Punishment کا تعلق ہے ایک سزا دی جائے گی۔ پھانسی دے دی جائے گی یا تلوار سے مار دیا جائے گا۔ امام محمد اور امام یوسف کے درمیان اس معاملہ میں تھوڑا فرق ہے لیکن عام اصول یہی ہے۔ اب یہ ایک فقہی بحث ہے کہ اس مذہب کی بنیاد کیا ہے تو ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ لا قصاص الا بحدید۔ دوسرے فقہاء اس کو کمزور قرار دیتے ہیں، لیکن میرے نزدیک احناف کا مذہب اس روایت پر نہیں بلکہ ان کے مذہب کی بنیاد اس چیز پر

ہے کہ صحیح عدل کا تقاضا اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرض کر لیجئے کہ ایک شخص نے پانی میں ڈبو کر مارا ہے تو کس طریقہ سے اس نے ڈبویا اور کتنی دیر میں اس کو ختم کر دیا۔ اب دوسرا شخص اس کو سزا کے طور پر ڈبو لے تو ممکن ہے کہ کئی بار کے ڈبونے کے باوجود بھی ایک سخت جان آدمی سلامت نکل آئے، تب اس شکل میں کیا ہوگا۔ دوسری پیچیدہ شکلیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ اب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صحیح طریقہ کیا ہوگا۔ صحیح عدل کا تقاضا تو اس طرح سے پورا ہو سکتا ہے کہ جب کسی نے مارا ہے، جس طریقہ سے بھی مارا ہے جب مار دیا ہے تو خاتمہ مرنے پر ہوا ہے لہٰذا اب اس کی سزا یہی ہونی چاہیے اور اس کے لیے ایک قاعدہ ہونا چاہیے۔ جو قاعدہ معروف ہے وہ یہ کہ سعودی حکومت تلوار سے ختم کر دیتی ہے اور آپ لوگوں کے ہاں پھانسی دی جاتی ہے۔ میرے نزدیک عدل کے پہلو سے ممکن طریقہ یہی ہے۔ دوسرے طریقہ میں بڑے جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ بات بھی ہے کہ سزائیں جتنی ہیں ان کو اختیار کرنے میں کیا طریقہ ہوگا۔ جو لوگ مظلوم کے ساتھ ہیں کیا ان کو اختیار دے دیا جائے گا کہ یہ سزا دے لو۔ لوگ یہ مانتے ہیں کہ یہی طریقہ ہوگا، لیکن اس میں بھی عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا بلکہ ظلم کا بڑا امکان ہے۔ میرے نزدیک دیت کا جو قانون اسلام میں ہے اور اعضاء کی دیت بھی متعین ہے تو مظلوم کے حامیوں سے صلح کی بات کی جائے گی۔ اگر وہ دیت لینے پر راضی ہو گئے تو فبہا اور اگر نہیں تو حکومت اپنی نگرانی میں اس شکل میں جو تاوان ہوگا دلوا سکتی ہے اور یہ بھی کہ سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اعضا کی دیت میں ٹانگ بھی کٹوا سکتی ہے، دانت بھی تڑوا سکتی ہے اور آنکھ بھی پھوڑ سکتی ہے، لیکن بہرحال یہ سب قاضی کی نگرانی میں ہوگا۔ قصاص کے معاملہ میں یہ خاص باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔

اس لڑکی کے معاملہ میں ایک تو یہ بات ہے کہ سزا جس کو دی گئی ہے وہ بیہودی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی شریعت کے مطابق یہ سزا دی گئی ہو۔ کئی معاملات میں ایسا ہوا لیکن آپ اس روایت کو دلیل نہیں بنا سکتے۔ ہمارے ہاں یہی طریقہ ہوگا کہ کسی نے کسی کو ہلاک کیا ہے تو اس کو سزا دے دی جائے گی۔ الجروح قصاص کا حکم ہے تو قصاص میں دیت بھی شامل ہے اور آپ اس کی دیت بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن کوئی اس پر مصر ہے کہ آنکھ ہی پھوڑی جائے تب تو مجبوری ہے اور اس شکل میں صرف قاضی کی نگرانی میں یہ کام ہوگا تاکہ انصاف کا حق ادا ہو۔

باقی رہ گئی احناف کی رائے تو یہ بین الاقوامی ذہن کے مطابق ہے، عقلیت پر مبنی ہے اور فطرت کے قانون سے ہم آہنگ ہے۔

درس موطا امام مالکؒ

(کتاب الجہاد)

باب : ما یجوز للمسلمین أکله قبل الخمس

باب: غنیمت کے مال میں سے مسلمانوں کے لیے خمس نکالنے سے پہلے کیا کھانا پینا جائز ہے۔

۱۹۔ قال و سمعت مالکا یقول لاباسا ان یاکل المسلمون اذا دخلوا ارض العدو من طعامهم ما وجد وا من ذالک کله قبل ان تقع المقاسم. قال مالک و انا أری الابل و البقر والغنم بمنزلة الطعام یاکل منه المسلمون اذا دخلوا ارض العدو کمایاکلون من الطعام و لو ان ذالک لا یوکل حتی یحضر الناس المقاسم و یقسم بینهم اضر ذالک بالجیوش فلا اری باساً بما اکل من ذالک کله علی وجه المعروف، ولا أری ان یدخر احد من ذالک شیئا یرجع به الی اهله.

ترجمہ: امام مالک کہتے ہیں کہ میرے رائے یہ ہے کہ اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمان دشمن کے علاقہ میں داخل ہوں تو وہاں سے کھانے پینے کی جو چیزیں بھی پائیں مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے ان میں سے کھانے پینے کے لیے لے لیں۔ کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ اونٹ، گائے، بکریاں بھی طعام کے حکم میں ہیں کہ جس میں سے مسلمان کھا سکتے ہیں جب وہ دشمن کے علاقہ میں داخل ہوں، جس طرح کہ کھانے کی چیزوں میں سے کھا سکتے ہیں۔ اگر یہ شرط ہو کہ جب تک لوگ تقسیم مال کے حاضر نہ ہوں اور وہ ان میں تقسیم نہ ہو جائے اس وقت تک اس میں سے کچھ بھی کھایا پیا نہ جائے تو اس سے فوج کو زحمت پیش آئے گی۔ اور میری رائے یہ ہے کہ مجموعہ میں سے معروف طریقہ پر برت سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں سے اپنے گھر لے جانے کے لیے ذخیرہ کرے۔

وضاحت: طعام کا لفظ سے مراد صرف 'تیار کھانا' ہی نہیں بلکہ یہ کھانے پینے کی چیزیں، گوشت، آٹا، مال

مویشی سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جب مسلمان دشمن کے علاقہ میں داخل ہوں کھانے پینے کی چیزیں بقدر ضرورت لے سکتے ہیں۔ ما وجد من ذالک یعنی جو چیزیں ان کو ملیں سب میں سے لے سکتے ہیں۔ طعام کے اطلاق کا دائرہ وسیع ہے۔ گوشت کی ضرورت ہے تو بکرے ذبح کر سکتے ہیں، لکڑی کی ضرورت ہے تو درخت کاٹ سکتے ہیں اور یہ اجازت مال غنیمت کی تقسیم کے مرحلہ کے آنے سے پہلے تک ہے۔ اس معاملہ میں مالکیہ کا فتویٰ یہ ہے اور یہی فتویٰ سب کا ہے۔ فوج جب دشمن کے علاقے میں داخل ہو جائے تو اسے وہاں کسی نہ کسی طریقہ سے غذا مہیا کرنا ہوگی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ سارا مال مجموعہ ہے اور ابھی تقسیم نہیں ہوا ہے تو فوج کا اور اسٹیٹ کا مشترک مال ہے۔ اس لیے تقسیم سے پہلے مجموعہ میں سے فوج بقدر ضرورت اپنے استعمال میں لا سکتی ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ مسلہ جنگی قوانین کے خلاف نہیں ہے اور آپ دشمن کے علاقہ میں کھانے پینے کی چیزیں لے سکتے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ البتہ اس کی اجازت نہیں کہ کوئی شخص اپنے گھر لے جانے کے لیے اس میں سے ذخیرہ کر لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کے معاملہ میں جو اخلاقیات ہیں وہ اسلام نے معین کر دی ہیں۔ ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، فوج صرف ضرورت کی حد تک لے سکتی ہے۔

۲۰۔ و سئل مالک عن الرجل یصیب الطعام فی ارض العدو فیاکل منه ویتزود فیفضل منه شی ایصلح له ان یحبسه فیاکله فی اهله أو یبیعه قبل ان یقدم بلاده فینتفع بثمنه. قال مالک ان باعه و هو فی الغزو فانی اری أن یجعل ثمنه فی غنائم المسلمین، و ان بلغ به بلده فلا اری بأساً ان یاکله و ینتفع به اذا کان یسیراً تافها.

ترجمہ: امام مالک سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص کو دشمن کے علاقہ میں کھانے کی چیزیں ملیں اور وہ اس میں سے کھالے اور زادراہ بھی اس میں سے رکھ لے اور اس میں سے کچھ بچے تو کیا اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اس کو روکے رکھے اور جب گھر والوں میں پہنچے تب کھالے یا اس کو بیچ کرے قبل اس کے کہ گھر پہنچے اور گھر پہنچ کر اس کی قیمت سے فائدہ اٹھائے! امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر اس نے جنگ کے دوران بیچا ہے تب تو میری رائے یہ ہے کہ اس کی قیمت سرکاری خزانے میں جمع کرنی ہوگی اور اگر وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے تو میں اس بات میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس سے خود فائدہ اٹھائے اگر وہ تھوڑی ہو۔

وضاحت: امام مالک کہتے ہیں کہ اگر دوران جنگ یعنی دشمن کے علاقہ میں ہوتے ہوئے اس نے بیچا ہے

تو قیمت سرکاری خزانے میں جمع کرا دے۔ اور اگر گھر آ گیا ہے اور شکل یہ ہے کہ چیز تھوڑی سی ہے تب وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کا امام مالک نے ذکر نہیں کیا کہ اگر چیز تھوڑی نہیں ہے تو کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ پھر سرکاری خزانے میں جمع کرنا پڑے گا۔ لیکن اس زمانے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب فوج کے سپاہی سروسامان، سواری، ہر چیز کا خود انتظام کرتے تھے۔ اب تو ہر چیز کا، سوئی دھاگے تک کا انتظام سرکاری ہوتا ہے۔ باقی یہ ہے کہ کھا پی تو سکتے ہیں لیکن کوئی چیز جمع کرنے کا اس زمانے میں فوجی ڈسپلن کے تحت کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

باب: ما یرد قبل ان یقع القسم مما اصاب العدو

باب: دشمن نے اگر کسی کے مال پر قبضہ کر لیا ہو اور وہ مسلمانوں کو مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آئے تو کیا وہ تقسیم سے پہلے اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہوگا؟

۲۱۔ حدثنی یحیی عن مالک انه بلغه ان عبداً لعبدالله بن عمر أبق، و ان فرساً له عار فاصابهما المشرکون، ثم غنمهما المسلمون فردا علی عبدالله بن عمرو ذالک قبل ان تصیبهما المقاسم. قال و سمعت مالکا یقول فیما یصیبه العدو من اموال المسلمین انه ان أدرک قبل أن تقع فیه المقاسم فهو رد الی اهله و اما ما وقعت فیه المقاسم فلا یرد علی احد.

ترجمہ: امام مالک سے مروی ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کا ایک غلام بھاگ گیا تھا اور ان کا ایک گھوڑا بھی کھو گیا تھا، مشرکوں نے ان پر قبضہ کیا پھر وہ دونوں مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے تو تقسیم سے پہلے وہ عبداللہ بن عمرؓ کو لوٹا دیے گئے۔ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ دشمن سے ان چیزوں پر قبضہ کر لیں جو مسلمانوں کا مال ہے تو جب وہ مل جائے تو تقسیم سے پہلے وہ مالک کو لوٹا دیا جائے گا اور جس مال کی تقسیم ہو چکی وہ کسی کو نہیں لوٹایا جائے گا۔

وضاحت: یہ بات تو بالکل معقول ہے اس لیے کہ وہ دشمن کا مال نہیں تھا، مسلمان کا مال تھا جو دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غنیمت میں جو مال مسلمانوں کے ملیں گے وہ مسلمانوں کو لوٹا دیے جائیں گے، وہ غنیمت میں شمار نہیں ہوں گے۔ مگر یہ غنیمت کی تقسیم سے پہلے ہوگا۔ تقسیم کے بعد فوج کا حصہ

الگ ہو گیا اور اسٹیٹ کا حصہ الگ ہو گیا۔

لیکن ایک بات اور بھی سمجھ آتی ہے کہ اگر مسلمان کا مال ہے وہ دشمن کے قبضہ میں چلا گیا تھا پھر واپس مسلمانوں نے حاصل کر لیا اور تقسیم بھی ہو گئی تو اگر اسٹیٹ کے مال میں پہنچا ہے تو پھر اسٹیٹ ایک شخص کے مقابل میں غریب تو نہیں ہوتی، اس کو چاہئے کہ وہ مال مسلمان کو واپس کر دے اگر مدعی کا دعویٰ صحیح ہے۔ اور اگر فرض کر لیجئے کہ وہ مال تقسیم میں کسی سپاہی کو مل گیا تو حکومت کو چاہیے کہ اس کو معاوضہ دے کر واپس مال مالک کو دلوا دے۔ بعض فقہا کی رائے یہ ہے اور میری بھی یہی رائے ہے۔

۲۱۔ وسئل مالک عن رجل حاز المشرکون غلامه ثم غنمه المسلمون. قال مالک صاحبه اولی به بغیر ثمن، ولا قیمة، ولا غرم مالم تصبه المقاسم، فان وقعت فی المقاسم فانی اری ان یکون الغلام لسیده بالثمن ان شاء. قال مالک فی ام ولد رجل من المسلمین حازها المشرکون، ثم غنمها المسلمون فقسمت فی المقاسم، ثم عرفها سیدها بعدالقسم انها لا تسترق و اری ان یفتدیها الامام لسیدها فان لم یفعل فعلی سیدها ان یفتدیها ولا یدعها، ولا اری للذی صارت له ان یسترقها، ولا یستحل فرجها، و انما هی بمنزله الحرة لان سیدها یکلف ان یفتدیها اذا جرحت فهذا بمنزله ذالک فلیس له ان یسلم. ام ولده تسترق و یستحل فرجها.

ترجمہ: امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا ایک شخص کے غلام کے بارے میں جو مشرکوں کے ہاتھ لگ گیا پھر وہ مسلمانوں کو غنیمت میں ملا۔ کہتے ہیں کہ اس کا آقا بغیر قیمت کے، بغیر معاوضہ کے اور بغیر تاوان کے اس کا حق دار ہے جب تک کہ غنیمت تقسیم نہ ہوئی ہو اور اگر مال تقسیم ہو چکا ہو تو کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کا ہو جائے گا اگر وہ چاہے تو قیمت پر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے کسی شخص کی ام ولد کو مشرکوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا پھر وہ مسلمانوں کو غنیمت میں ملی اور تقسیم بھی ہو گئی۔ پھر اس کے مالک نے اس کو پہچان لیا تو کہتے ہیں کہ وہ غلام نہیں بنائی جا سکتی اور میری رائے یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ اس کا فدیہ دے کر اس کے آقا کو دلوا دے۔ اور حکومت نہیں کرتی تو کہتے ہیں کہ اس کا آقا کا یہ فرض ہے کہ وہ فدیہ دے کر چھڑا لے اور اس کو چھوڑے نہیں۔ کہتے ہیں کہ جس شخص کو وہ ملے وہ اس کو غلام نہیں بنا سکتا اور نہ وہ اس کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم کر سکتا ہے۔ وہ آزاد کے حکم میں ہے۔ جس طرح اس سے کسی جرم کی نوعیت کی بات صادر ہو جائے تو اس کا آقا اس کو فدیہ دے کر چھڑانے کا مکلف ہے اسی طرح وہ اس معاملے میں بھی مکلف ہے کہ وہ اس کو فدیہ دے کر چھڑا لے۔ پس اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ ام

ولد کو غلام بنائے اور کسی کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم کرنے کے لیے چھوڑ دے۔

وضاحت: امام مالک کہتے ہیں کہ اگر غنیمت تقسیم نہیں ہوئی ہے تو بغیر کسی قیمت یا معاوضہ کے غلام اپنے آقا کو دے دیا جائے گا۔ لیکن اگر تقسیم ہو گئی ہے تو پھر آقا اگر چاہے تو قیمت ادا کر کے غلام کو لے سکتا ہے۔ یہ دوسری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میری رائے میں حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کا معاوضہ دے۔ کیونکہ جب تقسیم ہو گئی تو وہ غلام کسی شخص کو حق کے طور پر ملا ہے۔ اس سے غلام واپس لے کر اس کا حق پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

ام ولد اس لونڈی کو کہتے تھے جس کے ساتھ مالک نے تعلقات قائم کیے اور اس کی اولاد ہوئی۔ ام ولد پھر لونڈی نہیں رہتی۔ اس کا حکم آزاد کا ہوتا ہے پھر وہ بیچ ہو سکتی ہے نہ کسی اور کے تصرف میں جا سکتی ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی اصلاح اسلام نے کی تھی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ کوئی ام ولد مسلمانوں کو غنیمت میں ملی اور پھر وہ تقسیم بھی ہو گئی اور اس کے بعد اس کے مالک نے اس کو پہچان لیا، تو کہتے ہیں کہ وہ غلام نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ بہت بڑی اصلاح ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ام ولد کو اس کے مالک کے حوالے کیا جائے اور اس کی قیمت سرکاری خزانے سے ادا کی جائے اور کہتے ہیں کہ اگر حکومت یہ نہیں کرتی تو اس کے آقا کا یہ فرض ہے کہ وہ فدیہ دے کر چھڑا لے۔ امام مالک کا یہ فتویٰ کمزور ہے۔ حکومت اس کو چھڑانے کی ذمہ داری سے کس بنیاد پر دست بردار ہو گی؟

اب ان مسائل کی کوئی افادیت نہیں رہی اس لیے کہ لونڈی غلام کا مسئلہ Abolish ہو گیا اور یہ عین اسلام کے منشا کے مطابق ہے۔ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس کے خاتمے کی بنیاد ڈالی تھی جب کہ ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا اور اللہ تعالیٰ کی زمین کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں غلام نہ بکتے رہے ہوں اور گھروں میں نہ رہے ہوں۔ ارسطو اور افلاطون کی اسٹیٹ غلاموں کے بغیر بن ہی نہیں سکتی تھی۔ ہندوؤں کے سسٹم میں شودر کا ہونا ضروری ہے، ویش کا ہونا ضروری ہے اور ٹھیک ٹھیک وہی نظام افلاطون کی ریپبلک (Republic) میں بھی ہے۔ غلام نہ ہوں تو ان کی اسٹیٹ نہیں بن سکتی۔ اسلام میں پہلے دن سے ہی غلام آزاد کرنا سب سے بڑی نیکی قرار دی گئی۔

اب ان مسائل کی اہمیت نہیں لیکن یہ جان لیجئے کہ غلامی کے سسٹم میں بھی اسلام میں کیا ضابطے رہے ہیں۔

۲۲۔ وسئل مالک عن الرجل یخرج الی ارض العدو فی المفاداة، او لتجارة فیشتری الحر، او العبد، او یوهبان له، فقال اما الحر فان ما اشتراه به دین علیه، ولا

يسترق و ان كان وهب له فهو حر و ليس عليه شيء الا ان يكون الرجل اعطى فيه شيئا مكافاة فهو دين على الحر بمنزلة ما اشترى به، و اما العبد فان سيده الاول مخير فيه ان شاء ان ياخذه و يدفع الى الذى اشتراه ثمنه فذالک له، و ان احب أن يسلمه اسلمه، و ان كان وهب له فسيده الاول أحق به، ولا شيء عليه الا ان يكون الرجل اعطى فيه شيئا مكافاة فيكون ما أعطى فيه غرما على سيده ان احب ان يفتديه.

ترجمہ: امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا اس شخص کے بارے میں جو دشمن کے علاقہ میں نکل جاتا ہے قیدیوں کے فدیہ کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے یا تجارت کے مقصد سے اور وہاں وہ خریدتا ہے کوئی آزاد یا غلام یا دونوں اس کو تحفہ میں پیش کیے جاتے ہیں تو کیا حکم ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اگر آزاد ہے تو جس قیمت پر خریدا گیا وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا اور وہ غلام نہیں رہے گا اور اگر وہ اسے تحفہ میں ملا تو وہ آزاد ہوگا اور اس کے ذمہ کچھ نہیں ہوگا۔ مگر اس شخص نے جو کچھ بطور احسان اس پر خرچ کیا وہ آزاد کے ذمہ قرض ہوگا جیسا کہ وہ خریدا ہوتا تو وہ اس کے ذمہ قرض ہوتا۔ رہا غلام تو اس کا جو پہلا آقا ہے اس کے بارے میں اس کو اختیار ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو اس کو لے لے اور جس شخص نے اس کو خریدا تھا اس کو اس کی قیمت ادا کرے، اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو اس کو اختیار ہے اور اگر وہ اس کے حوالے کرنا چاہے تو کر دے اور اگر اس کو عطیہ میں دیا گیا ہو تو پہلا آقا اس کا حق دار ہے۔ اور اس کے ذمہ کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر آدمی نے، خریدنے والے نے، اس کے لیے کچھ مکافات کے طور پر دیا ہے تو جو کچھ دیا ہے وہ اس کے آقا کے ذمہ تاوان ہوگا۔ اگر وہ چاہے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑا لے۔

وضاحت: یہ مسائل اب تاریخی حقائق بن گئے ہیں۔ اب غلامی کا سسٹم ختم ہو چکا اور یہ یاد رکھیے کہ یہ عین اسلام کے منشاء کے مطابق ہوا ہے۔ اب اس سے صرف اس زمانے کی تاریخ واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں غلامی جائز رہی ہے تو غلاموں کے حقوق کے بارے میں قانونی ضابطہ سخت قسم کا اور بڑا وسیع بنایا گیا۔

باب: ما جاء في السلب في النفل

باب: جو غنیمت میں ملے اس کا کیا حکم ہے۔

جنگ میں دشمن مقتول سے جو اسلحہ اور سامان ہاتھ لگے اسے 'سلب' کہتے ہیں۔

۲۳۔ حدثني يحيىٰ عن مالک عن يحيىٰ بن سعيد عن عمرو بن كثير بن افلح عن

ابی محمدمولی ابی قتاده عن ابی قتاده بن ربعی انه قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ يوم حنين فلما التقينا كانت للمسلمين جولة. قال فرأيت رجلا من المشركين قد علا رجلا من المسلمين. قال فاستدرت له حتى اتيته من ورائه فضربته بالسيف على حبل عاتقه فاقبل على فضمني ضمة وجدت منها ريح الموت، ثم ادركه الموت فارسلني. قال فلقيت عمر بن الخطاب، فقلت ما بال الناس؟ فقال امر الله، ثم ان الناس رجعوا، فقال رسول الله ﷺ من قتل قتيلا له عليه بينة فله سلبه قال فقمت ثم قلت من يشهد لي ثم جلست ثم قال من قتل قتيلا له عليه بينة فله سلبه. قال فقمت، ثم قلت من يشهدلي، ثم جلست ثم قال ذالک الثالثة فقمت، فقال رسول الله ﷺ مالک يا ابا قتاده قال فاقتصصت عليه القصة، فقال رجل من القوم صدق يا رسول الله و سلب ذالک القتيل عندى فارضه عنه يا رسول الله فقال ابوبكر لا هاء الله اذا لا يعمد الى اسد من اسد الله يقاتل عن الله و رسوله فيعطيک سلبه، فقال رسول الله ﷺ صدق فاعطه اياه فاعطانيه فبعت الدرع فاشتريت به محرفا في بني سلمة فانه لاول مال، تأثلته في الاسلام. و حدثني مالک عن ابی شهاب عن القاسم بن محمد انه قال: سمعت رجلا يسأل عبدالله بن عباس عن الانفال فقال ابن عباس الفرس من النفل، و السلب من النفل. قال ثم عاد الرجل لمسالته' فقال ابن عباس ذالک ايضاً، ثم قال الرجل الانفال التي قال تبارک و تعالىٰ في كتابه ماهي. قال القاسم فلم يزل يسأله حتى كاد ان يحرجه ثم قال ابن عباس اتدرون ما مثل هذا مثل صبيح الذى ضربه عمر بن الخطاب.

ترجمہ: ابومحمد ابوقتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی جنگ کے سال میں نکلے تو جب مڈبھیڑ ہوئی تو مسلمانوں کو ایک گردش پیش آ گئی تو میں نے دیکھا کہ مشرکین میں سے ایک شخص مسلمانوں میں کے ایک شخص پر چڑھا بیٹھا ہے تو میں نے اس کے لیے کاوا لگایا یہاں تک کہ میں اس کے پیچھے آیا اور اس کی رگ گردن پر تلوار ماری تو وہ مجھ پر پل پڑا اور مجھے اس طریقے سے بھینچا کہ میں نے موت کی بو سونگھ لی پھر اس کو موت نے آ لیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پھر میں عمر بن خطاب کو ملا اور میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ کیا معاملہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم۔ پھر لوگ پلٹ آئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے دشمن میں سے کسی کو قتل کیا ہے اور اس کے پاس اس کی

واضح دلیل بھی ہوگی تو اس کا چھینا ہوا سارا سامان اس شخص کو ملے گا۔ تو میں کھڑا ہوا اور کہا کون میرے لیے گواہی دیتا ہے پھر میں بیٹھ گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا ہے اور اس کے پاس واضح دلیل ہے تو اس کا سلب اس کو ملے گا۔ پھر میں کھڑا ہوا اور کہا کہ کون میرے لیے گواہی دیتا ہے۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ تیسری بار آنحضرت ﷺ نے پھر یہی اعلان کیا تو میں کھڑا ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، ابوقتادہ، کیا بات ہے؟ کہتے ہیں کہ میں نے تمام قصہ عرض کیا تو لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ سچ کہتے ہیں یا رسول اللہ اور اس مقتول کا سامان وغیرہ میرے پاس ہے تو ان کو میری طرف سے راضی کر لیجے یا رسول اللہ۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا نہیں، اللہ کی قسم ہرگز نہیں، اگر یہ بات ہے کہ قتل انہوں نے کیا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ، اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر کا ارادہ کریں جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے جنگ کی ہے اور اس کا سلب تمہیں دلوا دیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہیں، ان کو یہ سامان دے دو۔ تو میں نے زرہ بیچ دی اور اس کے ذریعہ بنی سلمہ میں ایک باغ خرید لیا تو یہ پہلا مال ہے کہ اسلام میں آنے کے بعد میں نے سرمایہ کی حیثیت سے حاصل کیا۔

اور قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو سنا جو عبداللہ بن عباس سے انفال کے بارے میں فتویٰ پوچھ رہا تھا۔ ابن عباسؓ نے کہا گھوڑا بھی نفل میں شامل ہے اور سلب بھی نفل میں شامل ہے۔ پھر آدمی نے اپنا سوال دہرایا اور کسی چیز کا نام لیا تو ابن عباسؓ نے کہا کہ وہ بھی (نفل میں شامل ہے) پھر آدمی نے کہا کہ وہ انفال بتائیے کہ جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، اس سے کیا مراد ہیں، اس طرح وہ پوچھتا رہا اور قریب تھا کہ وہ ان کو تنگ کر دے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ جانتے ہو اس شخص کی مثال کیا ہے یہ صبیغ کی مثال ہے جس کی حضرت عمرؓ نے پٹائی کی تھی۔

وضاحت: یہاں دو روایتیں ایک ساتھ بیان ہوگئی ہیں۔ پہلی روایت ابومحمد سے ہے جو ابوقتادہ کے غلام تھے جن کو انہوں نے آزاد کر دیا تھا۔ جنگ حنین میں پہلے حملہ کے بعد مسلمانوں میں ایک بھگدڑ مچ گئی تھی یہاں **جولہ** کا لفظ ہے جس کے معنی گردش کے ہیں مطلب یہ کہ ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ حضرت ابوقتادہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ مسلمانوں کا یہ کیا ماجرا ہوا تو انہوں نے جواب دیا 'امر اللہ' اللہ تعالیٰ کا حکم۔ پھر لوگ پلٹے اور جنگ ختم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے دشمن میں سے کسی کو قتل کیا ہے تو اس کا سلب اس کو ملے گا یا مطلب یہ کہ سارا سامان اسلحہ، گھوڑا وغیرہ جو بھی مقتول کا ہوگا وہ اس مجاہد کو ملے گا بشرطیکہ اس کے پاس اس کی واضح دلیل ہو۔ دو بار ابوقتادہ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہتے کہ کوئی میرے لیے شہادت دیتا ہے اور شہادت نہ ملنے پر بیٹھ جاتے۔ شہادت کسی نے نہیں دی تو بیٹھ گئے، یہ ڈسپلن تھا۔

جب تیسری بار اعلان پر ابوقتادہ کھڑے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ متوجہ ہوئے اور پوچھا کیا بات ہے، ابوقتادہ۔ ابوقتادہ نے دشمن کو قتل کرنے کا سارا قصہ سنایا تو لوگوں میں سے ایک شخص نے گواہی دی کہ ابوقتادہ سچ کہتے ہیں، مقتول کا سامان وغیرہ میرے پاس ہے اور یا رسول اللہ آپ میری طرف سے ابوقتادہ کو راضی کر لیں۔ اگر وہ راضی ہو جائیں تو سامان میں رکھ لوں۔ قبل اس کے کہ آنحضرت ﷺ فیصلہ فرماتے، حضرت ابوبکرؓ بول پڑے کہ اللہ کی قسم یہ نہیں ہو سکتا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہیں اور سامان ابوقتادہ کو دلوا دیا۔ ابوقتادہ کہتے ہیں کہ زرہ کو بیچ کر انہوں نے ایک باغ خرید لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زرہ قیمتی رہی ہوگی اس لیے کہ مخرف کے معنی زمین کا ٹکڑا وغیرہ لیے جائیں تو اول مال تاثلته، کے الفاظ سے ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ زرہ چاہے کتنی ہی قیمتی ہو لوہے ہی کی ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ باغ خریدا تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا کھجور کے درختوں سے گھرا ہوا باغ خرید لیا ہوگا۔ بعض روایات میں حضرت ابوبکرؓ کے نام کی جگہ حضرت عمرؓ کا نام ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اب سارا معاملہ بالکل تبدیل ہو گیا ہے۔ اب سلب کا سوال نہیں پیدا ہوتا اور مال غنیمت جو بھی ملے گا وہ سارے کا سارا اسٹیٹ کا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب Standing Army کا دور ہے۔ فوج کے لیے کوئی معمولی اہتمام نہیں۔ ہر چیز ان کو ملتی ہے۔ اس زمانے میں ہر شخص سب کچھ خود مہیا کرتا تھا۔ پہلے خمس لے کر باقی مال فوج میں بطور غنیمت تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اب اس میں سے کوئی چیز فوج کا حصہ نہیں ہے سب اسٹیٹ کو ملے گا ہاں ایک چیز باقی ہے وہ ہے انعام۔ کمانڈر سے یا اس کی سفارش پر اب بھی فوج میں انعام مل سکتا ہے۔ ان روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں کتنی عظیم تبدیلی آ گئی تھی اور گنوار تک کتنے شائستہ اور مہذب بن چکے تھے۔

دوسری روایت قاسم بن محمد سے نقل ہوئی ہے۔ یہ روایت یہاں نقل کرنے کا کوئی مقام نہیں ہے اس لیے کہ اس سے کوئی فقہی حکم مستنبط نہیں ہوتا البتہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سوال کرنے میں بھی ایک حد ہونی چاہیے، زیادہ سوال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

متشابہات کے قسم کے سوالات لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ **صبیغ** کے بارے میں جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس کو بلا کر پٹائی کی تو اس نے کہا کہ اگر آپ میرے دماغ کا علاج کرنا چاہتے تھے تو وہ تو ہو گیا۔ باقی آپ کا ارادہ اگر مجھے قتل کرنے کا تھا تو مجھے ختم کر دیجیے تا کہ میں اس سے نجات پاؤں۔ یہاں اوپر روایت میں ابن عباس نے اس شخص کے متعلق جو بار بار سوال کر رہا تھا کہا کہ اس کی مثال صبیغ کی ہے۔

۴۵۔ قال و سئل مالک عمن قتل قتیلا من العدو ایکون له سلبه بغیر اذن الامام. قال لا یکون ذالک لاحد بغیر اذن الامام، ولا یکون ذالک من الامام الا علی وجه الاجتهاد و لم یبلغنی ان رسول الله ﷺ قال: من قتل قتیلاً فله سلبه الایوم حنین.

ترجمہ: امام مالک سے فتویٰ پوچھا گیا اس شخص کے بارے میں جس نے دشمنوں میں سے کسی شخص کو قتل کیا تو اس کو مقتول کا سامان جو چھینا گیا، بغیر امام کی اجازت کے مل جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ امام کی اجازت کے بغیر کسی کو نہیں ملے گا اور یہ معاملہ امام کی صوابدید پر ہے اور یہ بات مجھے نہیں معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کے سوا بھی یہ فرمایا ہو کہ جس شخص نے دشمن کو قتل کیا ہو تو اس کو اس کا سلب ملے گا۔

وضاحت: امام سے مراد امیر لشکر یا حکومت، سرکار ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ قانونی حق نہیں ہے کہ ہر شخص جس کو قتل کرے وہ اس کے سلب خود لے بلکہ امام کی یعنی سرکار کی صوابدید پر ہے۔ یہ مالکیہ کا فتویٰ ٹھیک ہے اور غالباً اس میں جمہور کا اتفاق بھی ہے لیکن اب یہ مسئلہ ہی ختم ہو گیا اور اب تو تمام تر سرکار کا ہے۔ الا علی وجه الاجتهاد کا مطلب یہ کہ جس نے قتل کیا ہے وہ اپنے حق کی حیثیت سے مطالبہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ کمانڈر یا حکومت کی صوابدید پر ہے۔ اب انعام جو دیا جاتا ہے وہ بھی حکومت کی صوابدید پر ہے کہ وہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ کسی شخص کی کارکردگی کیا ہے۔

امام مالک نے یہ بھی بڑی اچھی بات کہہ دی کہ آنحضرت ﷺ نے حنین کے موقع پر یہ بات کہی۔ مطلب یہ کہ اگر یہ اسلام کا مستقل قانون ہوتا تو تمام مواقع پر نافذ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تمام تر امیر لشکر کی صوابدید پر ہے۔ اب چونکہ فوج کا سارا سسٹم تبدیل ہو گیا ہے اس کی بنیاد نہیں رہی البتہ انعام اب بھی باقی ہے۔ مالکیہ کا یہ فتویٰ شبہات کو صاف کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خدا کی حجت قائم کر دینے کے لیے تو اس کی فطرت اور عقل کی رہنمائی ہی کافی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعہ بھی انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ (تدبر قرآن)

پروفیسر عبدالخالق فاروقی

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب

قرآن مجید سے متعلق نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سی قوموں کو اوپر اٹھاتا ہے اور بہت سی قوموں کو نیچے گراتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے علوم قرآنی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے ان میں سے ایک حصے کو تذکیر بایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

دنیا کے نقشے پر بڑی بڑی نامور قومیں ابھریں جنہوں نے اپنی قوت و عظمت اور شوکت و سطوت کی دھاک بٹھائی اور ترقی و تہذیب و تمدن کے بام عروج پر پہنچیں۔ قرآن مجید نے قوم نوح، عاد، ثمود، اہل مدین، قوم لوط، قوم سبا، آل فرعون وغیرہ کا ذکر ایسی ہی قوموں کی حیثیت سے کیا جو اپنے دور میں ترقی یافتہ اور بڑی متمدن قومیں تھیں لیکن ان ساری سربلندیوں کے باوجود یہ قومیں قعر مذلت میں گر گئیں اور ان کی فصل اس طرح کٹ گئی کہ ان کا نام تاریخ کے صفحات میں ایک داستان عبرت بن کر رہ گیا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (السبا، ۳۴:۱۹) آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔ انسان کی فطرت میں جستجو کا مادہ ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ انسانی جماعتیں اور گروہ ترقی کی منزلیں کیسے طے کرتی ہیں اور ایسا کیسے ہو جاتا ہے کہ جب وہ بام عروج پر پہنچ جاتی ہیں تو اس کے بعد زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس سوچ کے نتیجہ میں انسان نے کئی نظریات اور مفروضے قائم کیے چنانچہ انسان نے کبھی تو یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے، بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور بالآخر وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے، اسی طرح قوموں کی زندگی بھی ایک حیاتیاتی عمل ہے اور یہ بھی بالکل انسانی زندگی کی طرح بچپن، جوانی، بڑھاپا اور موت کی منازل سے گزرتی ہے۔ کبھی انسان شام و سحر کی طرف نظر دوڑاتا ہے کیونکہ تاریخ کا زمانے سے بڑا گہرا تعلق ہے لہٰذا اس نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ قوموں کی زندگی ایک چکر کی مانند ہے۔ جس طرح صبح کے بعد شام اور پھر صبح ہوتی ہے اسی طرح قوموں کی زندگی میں بھی یادگار لمحے آتے رہتے ہیں۔ موجودہ تہذیب کا انسان سائنس، ٹیکنالوجی اور مادی عروج و کمال کو انسانی ترقی کا رہین منت قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے قوموں کا عروج و زوال نہ مادی قوتوں پر منحصر ہے، نہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا اس میں عمل دخل ہے اور نہ تمدنی ترقیوں پر ہی اس کا انحصار ہے۔ نیز یہ حیاتیاتی عمل

کا نتیجہ بھی نہیں۔ یہ خالصتاً اخلاقی اور معنوی اقتدار کے اوپر منحصر ہے۔ یہ انسان کے اخلاقی کسب اعمال کا نتیجہ ہے جس کے تحت قومیں عروج و زوال کی طرف جاتی ہیں۔ قرآن نے اس بات کو مختلف انداز سے واضح کیا ہے اور ہر مرتبہ یہی بات کہی ہے کہ اس کا تعلق صرف اعمال اور اخلاق سے ہے:

وَ تِلْکَ الْقُرٰی اَھْلَکْنٰھُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا (الکھف:۵۹)

﴿اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے۔﴾

مزید فرمایا:

ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ (الروم:۴۱)

﴿خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔﴾

اس فساد کی لوگوں کی بداعمالیوں کے علاوہ کوئی اور وجہ نہ تھی۔ قرآن نے ایک پوری تہذیب کی مثال دی ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ
کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَھَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ
بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ٥ (النحل:۱۱۲)

﴿اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو بالکل امن و اطمینان کی حالت میں تھی، اس کے باشندوں کو رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا لیکن انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔﴾

ایک ایسی قوم جس پر ہر طرف سے معاشی ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، رزق بے پناہ آ رہا تھا، لیکن جب اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے یا ان کے پاس معاشی ترقی کے وسائل نہیں تھے بلکہ وہ جو اعمال کرتے تھے (بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ) اس کی بنا پر زوال آشنا ہوئے۔

یہ قرآن کا اتنا واضح، کھلا اور بین سبق ہے کہ ممکن نہیں کہ انسان قرآن کو پڑھے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ قوموں کی ترقی کا مدار مادی عوامل اور مادی عناصر پر ہے۔

ترقی و عروج کی بنیادیں:

قرآن مجید کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے چار اقدار ایسی دکھائی دیتی ہیں جن پر قوموں کی ترقی منحصر ہے۔ وہ ہیں ایمان، تقویٰ، صبر اور توبہ و استغفار۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات ان چاروں صفات کے فیصلہ کن ہونے پر دلیل ہیں:

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ (اعراف:۹۶)

﴿اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرتے تو ہم ان کے اوپر آسمانوں سے بھی اور زمین سے بھی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔﴾

اسی طرح فرمایا گیا:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا. (آل عمران:۱۲۰)

﴿اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لو تو ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی۔﴾

گویا تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو لیکن تمہارے پاس صبر اور تقویٰ ہو تو تمہارے دشمنوں کی کوئی تدبیر اور سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ آیت آج کل کے زمانے میں خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہم اپنے قومی سانحے اور مصیبت کے اسباب میں ان سازشوں کو تلاش کرتے ہیں جو ہمارے دشمن ہمارے خلاف کرتے ہیں لیکن قرآن کا بیان بالکل صاف رہنمائی کرتا ہے کہ اگر تمہارے اندر صبر اور تقویٰ ہو تو تمہارے دشمنوں کی کوئی سازش، کوئی مکر، کوئی تدبیر تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

بنی اسرائیل جو مصر کے اندر مغلوب اور محکوم تھے اور انتہائی ذلت اور مصیبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ قرآن نے ان کی حالت کو یُسْتَضْعَفُوْنَ (یعنی ان کو کمزور بنا دیا گیا تھا) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَھَا
الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
بِمَا صَبَرُوْا (اعراف:۱۳۷)

﴿ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کے رکھے گئے تھے، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکت سے مالا مال کیا تھا اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں میرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔﴾

گویا بنی اسرائیل پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تمام ہوئیں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے صبر کی روش اختیار کی۔

چوتھی چیز استغفار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات پر تعجب ہو کہ استغفار جس کے معنی گناہوں کی

معافی مانگنا ہے اس کا قوم کے عروج اور دنیاوی ترقی کے ساتھ کیا تعلق ہے لیکن قرآن نے جہاں بھی استغفار کی دعوت دی ہے اس کے ساتھ ہی اس نے مادی ترقیوں کا وعدہ بھی کیا ہے۔

حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ کے آگے استغفار کرو اور توبہ کی روش اختیار کرو:

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (ہود:۵۲)

﴿اور تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا﴾

حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو استغفار کی دعوت دیتے ہوئے اس کے نتیجے سے بھی آگاہ کیا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ (نوح:۱۰-۱۲)

﴿میں نے کہا، اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال و اولاد سے نوازے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔﴾

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں صفات کی حقیقت کیا ہے۔

ایمان: ایمان امن سے ہے۔ ایمان کے اصلی معنی امن دینے کے ہیں۔ اس لفظ کی حقیقی روح یقین، اعتماد اور اعتقاد ہے۔ جو یقین، خشیت، توکل اور اعتقاد کی خصوصیات کے ساتھ پایا جائے اس کو ایمان کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے وہ مومن ہے۔

ایمان کا نمایاں ترین پہلو اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (البقرہ:۱۶۵)

﴿ایمان والے اللہ کو سب سے بڑھ کر محبوب رکھتے ہیں۔﴾

گویا ایمان والے رنگ، نسل، قوم، زبان اور مال و دولت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔

ایمان کا لازمی ثمرہ جدوجہد بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ؕ (الحجرات:۱۵)

﴿حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر کوئی شک

نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔﴾

تقویٰ: تقویٰ کا مفہوم، جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا، رب قدیر سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا، گناہ سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا ہے۔ گویا متقی وہ شخص ہوگا جس کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کے غضب کا خوف سمایا ہوا ہو اور جس کو گناہوں کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو۔ تقویٰ دل کی تندرستی کی دلیل ہے اور اس سے علم اور عمل دونوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

صبر: صبر کے اصلی معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ صبر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے۔ اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس کی راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔

صبر بے بسی اور درماندگی کا نام نہیں بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔ صبر کے معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیے ہیں۔ فرمایا:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (البقرہ:۱۷۷)

﴿اور ثابت قدمی دکھانے والے تنگی میں، بیماری میں اور لڑائی کے وقت۔﴾

اس آیت میں صبر کے تین مواقع بیان کیے گئے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ۔ انسانی زندگی کے تمام مصائب اور شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں۔

استغفار: یہ سارے انبیاء کی دعوت کا جزء ہے۔ استغفار کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نہ صرف غلط اور صحیح کا احساس رکھیں، غلط سے بچیں اور صحیح پر عمل کرنے کی کوشش کریں بلکہ ہر وقت اپنے نگہبان اور نگران بنے رہیں۔ اپنا احتساب کرتے رہیں اور تلافی مافات کی بھرپور کوشش کرتے رہیں۔ اگر ہم ان چاروں چیزوں پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ یہ کس قدر بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر کسی قوم پر اللہ کی محبت ہر چیز کے مقابل میں غالب نہ ہو اور جب تک اس کے اندر اتنی استعداد اور قوت نہ ہو کہ جس کو صحیح کہے اس پر عمل کرے اور جس کو غلط کہے اس سے بچ جائے، جسے درست سمجھا ہے اس کے ساتھ چمٹی رہے، اس کے لیے کوشش کرے اور اپنے احتساب کا عمل جاری رکھے۔ جہاں غلطی ہو اس کا اعتراف کرے اور پھر اس غلطی کے برے اثرات سے بچنے کے لیے جہد و سعی کرے، وہ عروج کے راستے پر نہیں چل سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اسی ایمان، تقویٰ، صبر اور استغفار کی بدولت کوئی قوم عظمت، بلندی اور عروج کو پا سکتی ہے۔

محبوب سبحانی

نیا عالم۔ نئے نوامیس وقوانین

مجرموں اور وفاداروں کے اعمال کے ریکارڈ کے لیے الگ الگ کتابیں اور دفتر ہوں گے جن کی نگرانی فرشتے کریں گے۔ تحریری ریکارڈ سے مقصود یہ واضح کرتا ہے کہ اس میں کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان ہوگا نہ اس کے حجت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش ہوگی۔

سجین: مجرموں کے ریکارڈ آفس کا نام قرآن مجید میں سجین بیان کیا گیا ہے۔ سجین کے معنی قید خانہ ہے۔ اس مناسبت سے مجرموں کے ریکارڈ آفس کا نام سجین رکھا گیا ہے چنانچہ جس کا نام اس ریکارڈ میں درج ہوگا وہ تباہی سے دوچار ہوکر رہے گا۔ اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ کون دوزخ کے کس درجے میں داخل کیے جانے کا سزاوار ہے۔ قرآن میں یہ صراحت ہے کہ جس کے اعمال سجین میں درج ہوں گے وہ تباہ ہو جائے گا۔

علیون: نیک اور وفادار لوگوں کے اعمال کے ریکارڈ آفس کا نام قرآن میں علیون بتایا گیا ہے۔ اس کو جس اسلوب میں بیان کیا گیا ہے اس سے اس کی عظمت وشان ظاہر ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ جن عالی مقاموں کے نام علیون میں درج ہوں گے ان کو کن کن نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ کون جنت کے کس درجے کی نعمتوں کا سزاوار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی عدالت: اس عالم ناپائیدار کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد ایک بالکل نیا عالم نئے قوانین ونوامیس کے تحت ظہور میں آئے گا۔ اس عالم دنیا کے نوامیس طبیعی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہ سب بدل جائیں گے۔ اس زمین وآسمان کی جگہ نئے آسمان وزمین پیدا ہو جائیں گے۔ ہماری یہ زمین سورج کی روشنی سے روشن ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں ہمارا مشاہدہ محسوسات ومرئیات تک محدود ہے لیکن نئی زمین اللہ کے نور سے روشن ہوگی اس وجہ سے اس میں تمام معانی وحقائق بھی لوگوں کے سامنے آ جائیں گے پھر احکم الحاکمین کی عدالت قائم ہو جائے گی۔

ریکارڈ کے ساتھ محرکات: احکم الحاکمین کی عدالت میں نہ صرف اعمال کے ریکارڈ پیش ہوں گے بلکہ ان کے محرکات بھی سامنے آ جائیں گے۔ قرآن مجید میں صراحت ہے کہ قبروں میں جو کچھ ہے وہ سب اگلوالیا جائے گا یعنی دفینے تک نکلوالیے جائیں گے۔ ان کے ساتھ سینوں کے سارے راز بھی کھل جائیں

گے تاکہ ہر شخص پر حجت تمام ہو کہ کس نے کون سا عمل کس محرک کے تحت کیا ہے۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی غلط کام کرے وہ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا سا محرک تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر کو چپ کرا سکے اور اپنے آپ کو لوگوں کی تنقید و تحقیر سے بھی بچا سکے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے آپ کو مذہبی روپ میں پیش کرتے ہیں یا قیادت کے مقام پر فائز ہوتے ہیں یا ہونے کے متمنی ہوتے ہیں وہ اپنے باطن کو خلق کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے لیے اس طرح کا کوئی نہ کوئی لبادہ ضرور ایجاد کر لیتے ہیں لیکن قیامت کے روز ہر شخص کا سارا ریکارڈ اور اس کے محرکات اس کے سامنے رکھ دیے جائیں گے تاکہ وہ جان لے کہ اس کا رب اس کے ظاہر و باطن دونوں سے کتنا آگاہ ہے۔ فرمایا:

"کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبریں اگلوائی جائیں گی اور دلوں کے بھید نکلوائے جائیں گے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے اچھی طرح باخبر ہوگا"۔
(العٰدیات:۱۱۔۹)

عدالت کا مزاج: اللہ تعالیٰ کی عدالت میں سب سے پہلے ان لوگوں کی دادرسی ہوگی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ بے بس اور کمزور تھے اور جو اپنے اوپر گزرے ہوئے ظلم کی کسی کے آگے فریاد بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کو سب سے پہلے پکارا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ انھیں کس گناہ کی پاداش پر مارا گیا۔ سورۃ التکویر میں واضح طور پر زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کی دادرسی کا ذکر ہے جس سے اخروی عدالت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ اس دن سب سے پہلے وہ معصوم اپنی مظلومیت کی داد پائیں گے جو بالکل بے گناہ تھے اور وہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہوئے جن کو اللہ نے ان کا محافظ بنایا تھا۔ فرمایا:

"اور زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی"۔ (التکویر:۹۔۸)

اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ان کے قتل ناحق کا مقدمہ جو دنیا کی کسی عدالت میں نہ جا سکا اس کو رب العزت خود اپنی عدالت میں لائے گا اور اس کا فیصلہ فرمائے گا۔ اسی طرح ان مظلوموں اور بے بس لوگوں کے مقدمات بھی عادل وحکیم کی عدالت میں پیش ہوں گے جو دنیا میں داد و فریاد نہیں کر سکتے تھے۔

حاضری: اس دن سب کو اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے گا۔ اس دن سب کچھ خدا کے کامل کنٹرول میں ہوگا۔ ہر ایک کو خدا نے گن رکھا ہوگا اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوگا کہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہو جائے یا گنتی میں کوئی سہو ہو جائے۔ اس دن ہر ایک یکہ وتنہا حاضر ہوگا اس کے ساتھ نہ اولاد واحفاد ہوں گے نہ اعوان وانصار، نہ شرکا وشفعا۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا سب کو اپنے باب میں خود ہی جواب دہی کرنا ہوگی۔

مکذبین سے سوال: جب سارے مکذبین جمع ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرے گا کہ بتاؤ کیا تم نے میری آیات کی تکذیب کی درآنحالیکہ تمہارے علم نے ان کا پورا پورا احاطہ نہیں کیا تھا۔ اگر تم نے اس یوم حساب کو اس بنیاد پر جھٹلایا ہوتا کہ تمہارے پاس اسرار کائنات کا علم ہے تب تو تمہارا ایک موقف ہو سکتا تھا لیکن اس طرح کا محیط کل علم نہ رکھنے کے باوجود تم نے میری تنبیہات کی تکذیب کی۔ اب بتاؤ تمہارے پاس کیا عذر ہے۔ اس سوال کے جواب میں ان کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔ چنانچہ فرمایا:

> ''یہاں تک کہ جب وہ اکٹھے ہو جائیں گے تو پوچھے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تمہارا علم اس کا احاطہ نہ کر سکتا تھا یا کیا کرتے رہے اور ان پر بات پوری ہو جائے گی بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے''۔ (النمل:۸۵_۸۴)

مشرکوں کی بدحواسی: اس دن ہر امت کو طلب کیا جائے گا اور ان سے سوال ہوگا کہ خدا نے جو رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجے تھے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال ان کے جرم کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے ہوگا کہ خدا نے تمہاری ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے تاکہ حق ہر پہلو سے واضح ہو جائے اب تم بتاؤ تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی! اس وقت سب پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ کسی سے کوئی بات بنائے نہیں بنے گی۔ وہ ایسی سراسیمگی میں گرفتار ہوں گے کہ اس سوال کے جواب کے لیے کسی سے کچھ پوچھ پاچھ بھی نہیں سکیں گے۔ فرمایا:

> ''اور اس دن کو یاد کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ پچھ بھی نہیں سکیں گے''۔ (قصص:۶۷_۶۵)

لیڈروں اور پیرووں کی تو تکار: جب خدا کے حضور پیشی ہوگی تو پیرو، لیڈروں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور لیڈر پیرووں کو ملامت کریں گے کہ تم اپنی شامت کے خود ذمہ دار ہو کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد تم نے حق کے بجائے ہماری پیروی کی۔ غریب اور عوام اپنی غربت اور بے مائیگی کے سبب لیڈروں، سرداروں اور سرمایہ داروں کے زیردست اور آلہ کار بنے رہے اور انہوں نے اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے چلایا یہاں تک کہ اللہ اور رسول کی مخالفت کے لیے بھی ان کو استعمال کیا لیکن یہی غریب اور عوام اپنے لیڈروں اور سرمایہ داروں کو الزام دیں گے کہ یہ تم ہو کہ تمہاری بدولت ہم اس بدبختی سے دوچار ہوئے۔ تم نے ہماری راہ نہ ماری ہوتی تو ہم ضرور ایمان والوں میں سے بنتے۔ لیڈر

اپنے پیرووں کو جھٹ جواب دیں گے کہ تمہارا الزام بالکل غلط ہے کہ تم کو ہم نے اللہ کی راہ سے روکا بلکہ مجرم تم خود ہی ہو کہ نہایت واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی تم ہمارے پیرو بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق نہ ہم پر مخفی تھا نہ تم پر۔ اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی تھی۔ یہ بات نہ ہوتی تب تو کسی حد تک ہم کو الزام دینے میں تم حق بجانب ہوتے لیکن جب تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی ہے تو ہم کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے اپنے سر پیٹو۔ ہم بھی مجرم ہیں اور تم بھی مجرم ہو۔ عوام لیڈروں کے جواب میں کہیں گے کہ یہ تمہاری رات دن کی سازشیں تھیں کہ ہم حق کی پیروی سے محروم رہے۔ تم نے رسول کی ہدایت سے برگشتہ کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کی مہم چلا رکھی تھی اور ہمیں تم یہ بجھاتے اور سکھاتے تھے کہ ہم برابر کفر و شرک پر جمے رہیں۔ اس جواب سے یہ بات نکلی کہ ان کو اس امر کا اعتراف تو ہوگا کہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ اس وجہ سے اس کی پیروی نہ کر سکے کہ ان کے لیڈروں کی رات دن کی سازشوں نے انہیں اس کی پیروی سے محروم رکھا۔ چنانچہ فرمایا:

> ''اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے ان کی آپس میں تو تکار ہو رہی ہوگی۔ جو لوگ دبا کے رکھے گئے وہ ان لوگوں سے جنھوں نے تکبر کیا، کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ وہ لوگ جو بڑے بنے، ان لوگوں کو جو دبا کر رکھے گئے جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا جبکہ وہ تمہارے پاس آ چکی تھی بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ اور دبے ہوئے لوگ متکبرین سے کہیں گے بلکہ تمہاری رات دن کی سازشیں تھیں (جو قبول حق میں مانع ہوئیں) جبکہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں''۔ (سبا:۳۳_۳۱)

عوام جب یہ دیکھیں گے کہ ان کے لیڈروں نے ان کو کس گھاٹ میں لا کر اتارا ہے تو وہ غصہ سے دانت پیسیں گے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے رب جن انسانوں اور جنوں نے ہم کو یہ راہ دکھائی ہے ایک نظر تو ہمیں ان کو دکھا دے کہ ہم ان کو اپنے قدموں کے نیچے روند کر ان کے استکبار اور ان کی لیڈری کا مزا ان کو چکھا دیں اور ان کو ذلیل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ فرمایا:

> ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ کہیں گے اے رب ہمیں ان لوگوں کو دکھا جنہوں نے جنوں اور انسانوں میں سے ہم کو گمراہ کیا، ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے ڈالیں گے وہ ذلیل ہوں''۔ (السجدہ:۲۹)

آخر کار لیڈر کہیں گے کہ اب ایک دوسرے پر الزام تھوپنے سے کچھ حاصل نہیں۔ مجرم ہم بھی ہیں

اورتم بھی ہو۔ خدا کی وہ بات جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں کہی تھی کہ "میں تجھ کو اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا"۔ ہم دونوں پر پوری ہو چکی ہے۔ اب ہم کو لازماً وہ عذاب چکھنا ہے جو ہمارے جیسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔ ہم سزاوار ملامت اس صورت میں ہوتے جب ہم خود نیک ہوتے اور تم کو بد بنانے کی کوشش کرتے۔ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے تم کو بنانے کی کوشش کی۔ یہ تمہاری بے بصیرتی تھی کہ تم نے ہماری پیروی کی اور اس سے بڑی بے بصیرتی یہ ہے کہ ہماری پیروی کا جو انجام سامنے آیا ہے اس کے لیے مورد الزام ہم کو ٹھیراتے ہو! آخر اندرائن سے تم نے سیب کھانے کی توقع کیوں کی۔

اس دن عوام کا یہ عذر کچھ کام نہیں آئے گا کہ ان کی گمراہی کے ذمہ دار دوسرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے بالخصوص جب باطل کے مقابلہ میں حق کی دعوت دینے والے بھی موجود ہوں۔ اس وجہ سے ایسے عوام اور لیڈر دونوں عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔ ارشاد ہوا:

> "پس ہمارے اوپر ہمارے رب کی بات پوری ہو کر رہی ہم کو اس کا مزا چکھنا ہی ہو گا۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے"۔ (صافات:۳۱۔۳۳)

عمل اور جزا میں مطابقت: اس دن کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیا جائے گا۔ یہ عمل اور اس کی جزا میں مطابقت ہے جو لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کو بالکل معطل کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو اس کی یہ سزا دے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں گے جن کو پکڑ کر دوزخ کے داروغے ان کو دوزخ میں گھسیٹیں گے۔ یہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی بلکہ دنیا میں جو کچھ انہوں نے کیا اسکی اصل حقیقت ان کے سامنے اس شکل میں آئے گی۔ سورہ سبا میں فرمایا:

> "اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے۔ یہ وہی بدلہ میں پائیں گے جو وہ کرتے رہے تھے"۔ (سبا:۳۳)

اہل دوزخ کی آخری تدبیر: دوزخی جب یہ دیکھیں گے کہ یہاں ان کے شرکاء و شفعاء کام آنے والے بنے نہ ان کے لیڈر ہی ان کی کوئی مدد کر سکے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوزخ کے داروغوں سے التجا کریں گے کہ آپ ہی اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمارے عذاب میں زیادہ نہیں تو ایک دن کی تخفیف کر دی جائے تاکہ ہم ذرا دم لے لیں وہ جواب دیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تمہارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے ہیں۔ وہ کہیں گے: "ہاں! یہ بات تو ضرور ہے"۔ وہ جواب دیں گے: "اگر یہ بات ہے تو تم ہی درخواست کرو، ہم تمہارے جیسے لوگوں کے لیے کوئی درخواست نہیں کر سکتے"۔

اس وقت کافروں کی ہر دعا و فریاد اور ہر چیخ و پکار بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ نہ وہاں ان کے مزعومہ دیوی دیوتا ہوں گے نہ ان کے لیڈر کچھ کام آئیں گے اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کچھ شنوائی ہوگی۔ امید کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہو جائیں گے۔ سورہ مومن میں فرمایا:

> "اور اہل دوزخ، دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں ایک دن کی تخفیف فرما دے، وہ جواب دیں گے 'کیا تمہارے پاس تمہارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے!' وہ جواب دیں گے، ہاں آتے تو ضرور رہے۔ وہ کہیں گے "تو اب تم ہی درخواست کرو اور کافروں کی پکار بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی"۔ (مومن:۴۹۔۵۰)

حقیقی خسارہ: دنیا میں دکھ ہو یا سکھ بہر حال عارضی ہے لیکن آخرت کا عذاب ابدی ہے اس وجہ سے حقیقی خسارہ ان لوگوں کا ہے جو آخرت کے خسارہ سے دوچار ہوں گے۔ یہ ظالم لوگ ایک ابدی عذاب میں مبتلا ہوں گے جو کسی طرح ٹالا نہیں جا سکے گا۔ یہ ناعاقبت اندیش لوگ تو اپنی کامیاب دنیوی زندگی کے غرہ میں اہل ایمان کو خسارہ میں سمجھتے رہے حالانکہ وہ کوئی خسارہ نہیں تھا۔ حقیقی خسارہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے جس میں یہ بدقسمت لوگ مبتلا ہوں گے۔ فرمایا:

> "آگاہ رہو کہ یہ ظالمین ایک دائمی عذاب میں پڑیں گے"۔ (شوریٰ:۴۵)

اہل دوزخ کی ابدی مایوسی: اس دن متکبرین کا انجام ایسی ہولناک شکل میں ان پر مسلط ہوگا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے اپنے چہروں کو ڈھال بنانے کی کوشش کریں گے۔ آدمی کا سب سے زیادہ عزیز و اشرف حصہ اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ہر آفت سے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے سب سے پہلے کوشش کرتا ہے اور کسی طرح بھی اس کو گزند پہنچنے نہیں دینا چاہتا لیکن آخرت کے عذاب کا یہ حال ہوگا کہ اس دن متکبرین کے پاس کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہوگی جس کو وہ سپر بنا سکیں۔ اس وجہ سے وہ اپنے وہی چہرے آگے کرنے پر مجبور ہوں گے جن سے وہ لوگوں کے آگے اکڑتے رہتے تھے۔ ان کی اس بے بسی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ اس وقت ان پر کوئی رحم نہیں فرمائے گا بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ یہ جو کچھ تمہارے سامنے آیا ہے یہ تمہاری اپنی کمائی ہے اس وجہ سے اب اس کا مزا چکھو۔ فرمایا:

> "کیا وہ جو اپنے چہرہ کو عذاب بد کی سپر بنائے گا (اور وہ جو اس سے محفوظ ہوگا دونوں یکساں ہوں گے) اور ایسے ظالموں کو حکم ہوگا کہ جو کمائی تم نے کی ہے اس کا مزا چکھو"۔ (زمر:۲۴)

یہ عذاب ان پر اس طرح مسلط ہوگا کہ اس سے نجات پانا تو در کنار کبھی عارضی اور وقتی طور پر بھی

نہ ٹالا جا سکے گا اور نہ اس میں کوئی تخفیف ہی ہوگی۔ وہ اس سے بالکل مایوس ہوں گے۔ آخری درجہ میں یہ موہوم امید بھی کبھی سہارا بن جاتی ہے کہ شاید اس عذاب سے کبھی رہائی حاصل ہو جائے یا کبھی اس میں کوئی تخفیف ہی ہو جائے۔ لیکن ان بدبختوں کے لیے اس طرح کا کوئی موہوم سہارا بھی نہ ہوگا۔ آخر مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں وہ دوزخ کے جیلر سے کہیں گے کہ اے مالک اگر ہمارے لیے کسی رحم کی گنجائش نہیں رہی تو اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کرو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ فوراً ہی جواب دے گا کہ تمہارا خاتمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہیں اسی حال میں پڑے رہنا ہے۔ مایوس کے لیے آخری سہارا موت کا سہارا ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اس سہارے سے بھی محروم ہوں گے اور یہ ان کی سب سے بڑی محرومی ہوگی۔
سورہ زخرف میں فرمایا:

"وہ ان کے لیے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اس میں مایوس پڑے رہیں گے"۔

(زخرف: ۷۵)

"اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک اب تمہارا رب خاتمہ ہی کر دے وہ جواب دے گا
نہیں اسی حال میں رہنا ہے"۔ (زخرف: ۷۷)

اس دن سب کی زبانیں گنگ ہوں گی کسی کے منہ سے بات نہیں نکلے گی۔ اس دن اللہ تعالیٰ مجرموں کو براہ راست خطاب کر کے ارشاد فرمائے گا کہ تم جس یوم الفصل کی تکذیب کرتے رہے تھے آج اس کی عدالت تمہارا فیصلہ سنانے کے لیے قائم ہو گئی ہے۔ دیکھ لو ہم نے تم کو بھی جمع کر لیا اور تمہارے اگلوں کو بھی۔ واضح رہے کہ جب قیامت کا مذاق اڑاتے تھے تو یہی کہتے تھے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو اس دن ہمارے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے۔ وہ اس طنزیہ سوال سے قیامت کو ناممکن سے ناممکن تر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ بھلا یہ بات کس طرح تصور کی جا سکتی ہے کہ ہمارے تمام اسلاف بھی ایک دن قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ اگلے پچھلے سب موجود ہیں اگر وہ کچھ مدد کر سکتے ہیں تو ان کی مدد بھی حاصل کر لو۔ چنانچہ فرمایا:

"یہ ہے فیصلہ کا دن۔ ہم نے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی جمع کر لیا۔ تو تمہارے پاس
کوئی داؤ ہے تو وہ ہم سے کر دیکھو۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے"۔

(مرسلت: ۳۸-۴۰)

گواہیاں: قیامت کے دن اگرچہ مجرم اپنی پشیمانیوں سے پہچان لیے جائیں گے تاہم عدل و انصاف کے تقاضوں اور اتمام حجت کے پیش نظر کفار اور مشرکین کے خلاف ان کے جرائم کے متعلق گواہیاں ہوں گی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اکٹھا کرے گا جن کی عبادت کے وہ مدعی رہے ہوں گے یا جن کی

طرف انہوں نے اپنی بدعات منسوب کی ہوں گی۔

فرشتوں کی گواہی: فرشتوں کو طلب کیا جائے گا اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ یہ مشرکین مدعی ہیں کہ وہ تمہاری عبادت کرتے رہے ہیں۔ تو کیا تم نے انھیں اپنی عبادت کا حکم دیا تھا اور تمہارے سامنے انھیں قربانیاں دینے اور نذریں گزارنے کی ہدایت کی تھی۔ فرشتے اس سوال کا فوراً یہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے اور ارفع ہے اس بات سے کہ کوئی تیرا شریک و سہیم ہو۔ فرشتوں کے اس جواب سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شرک ایسی گھناؤنی چیز ہے کہ فرشتے اس کا ذکر سنتے ہی اپنی نفرت کا اظہار کریں گے۔ دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ وہ اس کو اپنے اوپر ایک سنگین تہمت خیال کریں گے کہ کچھ ظالموں نے ان کو شرک کی گندگی میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ تیسری بات یہ نکلی کہ جن احمقوں نے ایسا کیا اس کی تمام ذمہ داری ان ہی پر ہے۔ فرشتے اس سے بری ہیں کہ وہ کسی کو اپنی عبادت کا حکم دیں۔ فرشتوں کا یہ جواب بالکل حقیقت کے مطابق ہوگا اس لیے کہ فرشتوں کے نام سے انھوں نے جو بت بنائے مثلاً لات، منات اور عزیٰ وغیرہ تو یہ محض ان کے اپنے فرض کیے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّی موجود نہیں تھا۔

فرشتے یہ بھی کہیں گے کہ ہمارے پرستش کا انہیں زعم تو بالکل باطل ہے البتہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ فرشتوں کی یہ بات بھی بالکل حقیقت کے مطابق ہوگی کیونکہ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے کاہنوں کے ذریعے سے جنوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور چونکہ ان کو وہ علم غیب کا ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے ان کے لیے چڑھاوے اور قربانیاں بھی پیش کرتے تھے، ان کی جے پکارتے تھے اور انہیں نافع وضار سمجھتے تھے۔ فرشتوں کے اس بیان کے بعد ان کے پجاریوں سے کہہ دیا جائے گا کہ تمہارا سارا اعتماد جن فرشتوں پر تھا ان کی گواہی تم نے سن لی۔ پس آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔ نہ وہ تمہیں کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ تم ان کو۔ سبا میں فرمایا:

"اور اس دن کو یاد رکھو، جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے
پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں! وہ جواب دیں گے کہ تو پاک
ہے۔ ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے! بلکہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں،
ان کی اکثریت ان ہی پر ایمان رکھتی تھی۔ پس آج تم سے کوئی ایک دوسرے کو نہ تو
کوئی نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ
کے عذاب کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو"۔ (سبا: ۴۰-۴۲)

اعضاء کی گواہی: اس دن مجرموں کے مونہوں پر مہر کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے اعضاء کو ناطق بنا دے گا جو ان کی ساری کارستانیوں کی سرگزشت سنا دیں گے۔ مونہوں پر مہر کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ زبان

جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور عذر بھی تراش سکتی ہے جبکہ ہاتھ پاؤں وہی کچھ بیان کریں گے جو انھوں نے کیا ہوگا اس طرح انسان کے اعضاو جوارح حجت قائم کردیں گے۔ یہ حجت، تمام حجتوں پر بھاری ہوگی۔ فرمایا:

''آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کردیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے''۔ (یٰس: ۶۵)

رسولوں کی گواہی: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام انبیاء کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا کہ انھوں نے اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی اور ان کی امتوں نے اس تعلیم کے باب میں کیا رویہ اختیار کیا؟

انبیاء سے یہ سوال انفرادی طور پر ان کے منکروں کے متعلق نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کی امتوں کے متعلق کیا جائے گا کہ جن لوگوں کو تم نے اللہ کے عہد و میثاق میں داخل کیا ان کا رویہ اور ردعمل کیا رہا؟ انبیاء علیہم السلام لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانہ تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہیں اپنی امتوں کے بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملہ کو خدا ہی کی طرف تفویض کریں گے۔ فرمایا:

''اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا! وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں غیب کی باتیں جاننے والا تو بس تو ہی ہے''۔ (مائدہ: ۱۰۹)

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ میثاق الٰہی کی ذمہ داری نبی اور امت دونوں پر عائد ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں دونوں سے سوال ہوگا۔

حضرت عیسیٰ کی گواہی: قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اس سے دوسرے انبیاء کی گواہی کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا کہ کیا تم نے نصاریٰ کو تعلیم دی تھی کہ اللہ کے سوا مجھ کو اور میری ماں کو معبود بناؤ۔ حضرت عیسیٰ جواب میں عرض کریں گے کہ بھلا میں ایسی بات زبان سے کیسے نکال سکتا تھا جس کا مجھے حق نہیں تھا، نہ تو تو نے یہ کہنے کا مجھے مجاز کیا تھا نہ دنیا کی خلق و تدبیر میں میری کوئی حصہ داری تھی کہ میں اس کا مدعی بنتا۔ میں جب تک ان میں موجود رہا اس وقت تک تو میں دیکھتا رہا کہ وہ کیا بنا رہے ہیں لیکن جب تو نے مجھے اٹھالیا تو مجھے کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا۔ مقصود اس سوال و جواب سے یہ ہوگا کہ نصاریٰ جنھوں نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو خدا کا شریک بنایا پورے مجمع میں پوری طرح رسوا ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

''اور یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا

کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی تو، تو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، پر میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے، غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے''۔ (المائدہ: ۱۱۸۔۱۱۶)

قیامت کے دن نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر جو بھی انعام ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ انہوں نے جو معجزے بھی دکھائے سب اللہ کے اذن اور حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے ان کو جن خطرات میں ڈالا ان سے ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا اور پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا جس کے سب سے بڑے گواہ حضرت عیسیٰ خود ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہر ہر بات پر آمنا وصدقنا کہیں گے تو پھر نصاریٰ بتائیں کہ انہوں نے کس کے کہنے پر ان کو خدا بنایا۔ جب وہ سب کچھ سے خدا کے اذن سے ہوئے اور اس کا اعتراف خود معجزات دکھانے والا کرے گا تو نصاریٰ کے حصہ میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

''جبکہ اللہ تعالیٰ کہے گا، اے عیسیٰ ابن مریم! میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیا۔ جبکہ روح القدس سے تمہاری تائید کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ ہوکر بھی۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی اور یاد کرو جبکہ تم مٹی سے ایک مورت پرندے کی صورت کی مانند میرے حکم سے بناتے تھے اور پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور یاد کرو جب تم مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے اور یاد کرو جبکہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دور رکھا جبکہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان کافروں نے کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے''۔ (المائدہ: ۱۱۰)

نعیم احسن اصلاحی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور

سوال: کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے کیونکہ اس بارے میں متضاد قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اگر وہ آتے ہیں تو آئیں' چشم ما روشن دل ما شاد۔ وہ ایک عاقل، نہایت خدا ترس، نزور دار داعی، اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول اور تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ آئیں تو ہم بھی ان کو دیکھ لیں گے اور نہ آئیں تو کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ رسول خاتم آ چکے ہیں۔ وہ کامل ہیں، ان کا دین مکمل ہے، ان کی لائی ہوئی شریعت محفوظ ہے اور قرآن محفوظ ہے۔ پھر یہ کہ ہدایت کا انتظام بھی ہوئی ہے اور انٹرنیشنل کر دیا گیا ہے۔ پہلے قومی انبیاء آتے تھے "لکل قوم ھاد" اب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام کر دیا کہ اپنی آخری کتاب دین فطرت پر اتاری جس میں دوسرے لواحق اور تضمنات کا کوئی ذکر نہیں۔ قرآن فطرت انسانی پر نازل ہوا اور اس کو بہرحال ایک زبان ہی میں اترنا تھا تو ایک نبیؐ پر اتارا جو انہیں میں سے تھا اور دنیا میں اس کو پھیلانے کے لیے ایک بین الاقوامی نظام قائم کر دیا۔ یعنی یہ کہ اس امت کو شہداء اللہ فی الارض بنا دیا ہے تاکہ یہ امت اللہ کے دین کی تمام دنیا میں گواہی دے۔ ظاہر ہے کہ امت تمام تر افراد ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں حبش کے بلال بھی ہیں، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان بھی اور جیسے جیسے یہ پھیلتا گیا تمام دنیا کے لوگ اس میں شامل ہوئے۔ اس میں ایک تکوینی نظام بھی ہے وہ یہ کہ دنیا کا چاہے کتنا ہی بگاڑ ہو جائے لیکن اس امت کے اندر ایک قلیل گروہ حق پر قائم رہنے والا، سنت کے اوپر قائم رہنے والا ہمیشہ رہے گا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت محرف ہو کر مٹ جاتی تھی۔ اب قرآن مجید کے متعلق یہ ہے کہ اس میں آگے سے کوئی تحریف ہو سکتی ہے نہ پیچھے سے۔ یہ محفوظ ہے۔ تکوینی نظام یہ کہ دین کی گواہی دینے والا 'شہداء اللہ' کا ایک گروہ قیامت تک اس میں رہے گا۔ یہ امت کسی قوم پر مبنی نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان پر مبنی ہے، ہر طرف کے لوگ اس میں شامل ہیں اور اس کو کسی وطن کسی قومیت کے دائرہ میں بند نہیں کیا ہے۔ ہدایت کے اس کامل تکوینی نظام کی موجودگی میں کسی کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سوال: کیا یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص قربانی کرنا چاہے اسے چاہیے کہ ذوالحج کا چاند

دیکھنے سے لے کر قربانی کرنے تک اپنے ناخن اور بال نہ کاٹے، کیا یہ حکم صرف حجاج کے لیے ہے یا سب لوگ اس میں شامل ہیں اور کیا یہ سچ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں ہمیشہ قربانی کرتے رہے ہیں۔

جواب: اس میں شبہ نہیں کہ ناخن اور بال کے متعلق حکم تو صرف حجاج ہی کے لیے ہے۔ ہم اور آپ یہاں جو قربانی کرتے ہیں یہ حج کے لیے ہے، اس تمنا کا اظہار ہے کہ کاش ہمیں بھی اس در پر حاضری کا موقع ملے اور وہاں جا کر ہم قربانی کریں۔ یہ قربانی جو یہاں ہم کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، کوئی فرض یا واجب نہیں ہے اور جو لوگ کہ قربانی کرنا چاہیں کہ ان کے لیے یہ آداب میں ہے کہ ناخن یا بال نہ کاٹیں۔ ظاہر ہے کہ حاج کے لیے تو تمام پابندیاں احرام کی ہوتی ہیں لیکن یہاں ہم اس حد تک بھی کریں تو ایک پسندیدہ بات ہے، حکم نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ مدینہ میں قربانی کرتے رہے ہیں تو اس کے متعلق میں کوئی قطعی بات اس وقت نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ بات قطعی ہے کہ اجل صحابہ نے جو دین کے تقویٰ کے اعتبار سے نمونہ ہیں قصداً چھوڑی ہے کہ لوگ اس کو فرض یا واجب نہ مان لیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کریں تو فبہا اور نہ کر سکے تو بہرحال آپ گنہگار نہیں ہیں۔

سوال: من زار قبری وجبت له شفاعتی۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس بارے میں کیا کہا جائے۔ ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن میں جتنی تفصیل سے توحید کا مضمون بیان ہوا ہے اتنی ہی وضاحت کے ساتھ شفاعت بیان ہوئی ہے۔ اس میں یہ فرمایا ہے کہ کوئی بھی ناز و تدلل کے ساتھ آگے بڑھ کر یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہے کہ میں اس کو جانتا ہوں یہ میرا ہی رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی اس پوزیشن میں نہیں کہ یہ کہہ سکے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اس کا خالق اس کا مالک اس کو روزی دیتا رہا، اس کی سات پشتوں سے واقف وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ جس کو اجازت دے گا اور جس کے بارے میں اجازت دے گا وہ کہیں گے "قال صوابا" اور حق کہیں گے۔ اس میں کسی دخل فعل کی گنجائش نہیں۔

اگر یہ مان لیجیے، جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے تو قرآن میں جو قانون بیان ہوا ہے وہ باطل ہو جائے گا، وہ سارے شرائط تو ان میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ آیت الکرسی ہی میں بیان ہو گئے ہیں جو کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ اب آپ بتائیے اگر کچھ گنجائش نکلتی ہے۔ یہ بات ہے کہ بعض جگہ ایسا ہے کہ کچھ گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً سورہ نساء کی آیات ۱۷۔۱۵ میں آیا ہے اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ

یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًاo وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ". اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًاo

یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا واجب ہے کہ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے اور فوراً توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے گا۔ اور جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے اور موت کو دیکھ کر توبہ کی یا کافری مرے تو ان کی کوئی توبہ نہیں، کوئی معافی نہیں ہے۔ اب بیچ میں ایک گنجائش نکلتی ہے جس سے ہم شا کو امید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو نہیں ہوا کہ ہم اسی پر مرے ہوں لیکن یہ بھی نہیں ہوا کہ فوراً توبہ کر لی ہو تو بیچ میں ایک موقع نکلتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کا بہت سا حصہ گناہوں میں گزار دیا لیکن بہر حال توبہ کی تو نہیں ہو گی اور اصلاح کر لی ہو۔ تو ایسے لوگ جو ہوں گے ان کے متعلق امید یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء اور رسولوں کی عزت افزائی کے طور پر پوچھے گا کہ کہو کیا فرماتے ہو تو جیسے کہ قرآن مجید میں حضرت مسیح کے بارے میں بیان ہے کہ وہ عرض کریں گے کہ آپ سزا دیں تو آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ عزیز و حکیم ہیں۔ بیچ کے متعلق قرآن خاموش ہے یعنی اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے توبہ تو کر لیتا ہے لیکن زندگی کا بہت سا حصہ گناہ میں گزار رہا ہے تو اس کے متعلق قرآن نے نفی نہیں کی ہے تو امید رکھنی چاہیے۔ یہ ایک مثال میں نے دی ہے اور مثالیں اس لیے بیان نہیں کرتا کہ آپ لوگوں کے اندر جرأت نہ پیدا ہو جائے۔

میت کے لیے جو دعا آپ کرتے ہیں وہ میت کے لیے آپ کی شفاعت ہے۔ قرآن میں ذکر ہے، اہل ایمان کے لیے شفاعت فرشتے بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ شفاعت ہوتی رہتی ہے اور جو ان کے حق دار ہوں گے ان کو فائدہ پہنچے گا۔

نصاریٰ کا سارا بھروسہ شفاعت پر ہے اور ان کے عقیدے کی بنیاد یہی ہے اس لیے کہ ان کے ہاں نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حقیقت سورہ مائدہ میں بتا دی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا پورا قول نقل کیا ہے۔

سوال: اہل دین اپنے خطبہ ہائے جمعہ میں اکثر یہ بات دہراتے رہتے ہیں کہ مزارعت ناجائز ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، غیر حاضر مالک اراضی کا تصور اسلام میں مفقود ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینوں پر گئے وہاں اتنے دن رہے اور وہاں

سے واپس آ گئے۔ یہ اور دیہات کے کھیتوں کے متعلق ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کا نام صرف اس لیے لیتا ہوں وہ تقویٰ اور تقدس کی بے نظیر مثال ہیں۔ آپ جا [illegible] اور کچھ نہیں بہر حال دین کے معاملہ میں متشدد تھے۔ ان کی زمین فاصلہ پر تھی اور وہ کئی کئی دن وہاں جا کر رہتے تھے۔ وہ خود کاشت تو نہیں کرتے تھے، کاشت تو ان کے مزارع کرتے رہے ہوں گے یا جس طریقہ سے بھی ان کی کاشت ہوتی رہی ہو۔ پھر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانے میں خیبر کی زمینوں کا یہی انتظام کیا تھا۔ یہود نے آ کر کہا کہ ہم مزارعت کریں گے آپ اپنا حصہ لے لیں اور لوگ لیتے رہے۔

مزارعت کی جو شکلیں تھیں ان میں سے کوئی شکل آپ اختیار کر لیں۔ ایک شکل تو یہ تھی کہ بٹائی پر اور جن شرائط پر طے ہو جائے۔ فصل ہوئی تو اپنا اپنا حصہ بانٹ لیا، یہ ہوتا رہا ہے۔

فقہا کا جہاں تک تعلق ہے تو سب مانتے ہیں۔ شاید امام ابوحنیفہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ وہ نہیں مانتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ان کے بعد ان کے دونوں بڑے شاگردان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے، یہ بھی لکھا ہے۔ لیکن میں امام ابوحنیفہ کے متعلق بھی یہ رائے رکھتا ہوں کہ وہ ایسی غیر عقلی بات نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ یوں ہی لوگوں نے یہ بات ان سے منسوب کر دی ہو۔

سوال: نفع نقصان کی شراکت کی بنیاد پر جو کھاتے بنکوں میں کھولے جاتے ہیں ان پر منافع دیا جاتا ہے، کیا یہ سود کی زد میں نہیں آتا؟

جواب: اس کے متعلق تو ان کی شرائط کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بعض میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قباحت نہیں ہے لیکن وہ سب زبانی باتیں ہیں۔ جائز ہونے کے لیے بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ داری کا [illegible] Risk ہے۔ آپ کی خدمت کرنے کے لیے خطرہ مول لیتا ہے تو اس پر جو منافع آئے وہ حلال و طیب ہے، جائز ہے۔ لیکن گھر میں محفوظ کمین گاہ میں بیٹھ کر نفع حاصل کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سانڈ دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے۔ یہ میں نے فلسفہ بتا دیا، جب تک شرائط معلوم نہ ہوں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

سوال: تاج کمپنی جو قرآن مجید کی طباعت کا کاروبار کرتی ہے۔ ایک مقرر منافع دیتی ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب: ایک مقرر منافع کیسے دے سکتے ہیں۔ یہ شکل تو بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ وہ محفوظ کمین گاہ میں بیٹھے ہیں۔ فرق تو ہونا چاہیے یعنی اتار چڑھاؤ ہونا چاہیے۔ صرف جائز بنانے کے لیے نہیں بلکہ واقعتاً